توحید

- سیرت طیبہ کے چند نقوش
- خدا کی فطری معرفت
- اسلامی اصولوں کی فتح
- اسلامی تفکر میں فلسفہ کا کردار
- تاریخ طبری اور اسرائیلیات

اسلامی، علمی، فکری، دوماہی رسالہ

جلد ۷، شمارہ ۶
ربیع الاول و ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ
اکتوبر، نومبر ۱۹۹۰ء

توحید

مقاصد

کلمۃ التوحید و توحید الکلمۃ

- قرآن و سیرت و سنت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری و سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

سالانہ بدل اشتراک

ملک	
ایران	۹۰۰ ریال
پاکستان	۷۵ روپے
ہندوستان	۷۵ روپے
بنگلہ دیش	۷۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۵۰ درہم
سعودی عرب	۵۰ ریال
قطر	۵۰ ریال
کویت	۴ دینار
افریقہ	۲۴ ڈالر
برطانیہ	۱۲ پونڈ
امریکہ	۲۴ ڈالر
کینیڈا	۲۷ ڈالر

ارباب نظر و صاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔ ادارہ۔

خطاطی: قلبی حسین رضوی کشمیری

توحید

اسلامی
علمی
فکری
دوماھی رسالہ

جلد ۷ شمارہ ۶

ترتیب

شذرہ

اگر مسلمانوں کو اب بھی ہوش نہ آیا! — مدیر — ۵

قرآن

بیان تفسیر — جناب سید مرتضیٰ حسینؒ صدر الافاضل — ۱۱

عقائد و معارف

حضرت عیسیٰؑ — شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر — ۱۷

جزا و سزا اور تجسم اعمال — جناب شیخ حسین نوری — ۲۵

خدا کی فطری معرفت — جناب محمد تقی مصباح یزدی — ۳۲

مجلہ توحید (اردو)
پوسٹ بکس ۳۴۵۵ - ۳۷۱۸۵
قم
جمہوری اسلامی ایران
فون : ۲۸۴۱۸

ربیع الاول ــ ربیع الثانی سنہ ۱۴۱۱ھ / اکتوبر ــ نومبر سنہ ۱۹۹۰ء

فکر و فلسفہ

سیرت طیبہ، افکار امام خمینیؒ کی روشنی میں	جناب سید احتشام عباس زیدی	۵۱
فرعونی آمریت کے خلاف اسلامی اصولوں کی فتح	جناب سید ولی الحسن رضوی	۵۷
عرفانی اصطلاحیں	شہید استاد مرتضیٰ مطہری	۶۹
اسلامی تفکر میں فلسفہ کا کردار	جناب شیخ جوادی آملی	۸۱
حکومت اور عوام کے ایک دوسرے پر حقوق	جناب محمد تقی رہبر	۹۷
تہمت	جناب ناصر باقری بید ھندی	۱۰۷

تاریخ و سیر

رسول اسلامؐ روایات کی روشنی میں	جناب علامہ طباطبائیؒ	۱۲۷
تاریخ طبری اور اسرائیلیات	جناب سید جعفر مرتضیٰ عاملی	۱۳۵
فہرست کامل جلد ہفتم	ادارہ	۱۶۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

○ ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔

○ مندرجات توحید نقل کرنے کی اجازت ہے لیکن توحید کا حوالہ ضروری ہے۔

شذرہ

اب بھی اگر مسلمانوں کو ہوش نہ آیا!!

۲ اگست ۱۹۹۰ء کی رات کو عراق نے اپنے پڑوسی، اور ایران عراق جنگ میں اپنے ایک بہت بڑے حلیف و مددگار پر حملہ کر دیا۔ ایک روز کے اندر ۱۷ ہزار مربع کلومیٹر وسیع ملک پر قبضہ کر کے اس نے کویتی سلطنت کے قدم اکھاڑ دیئے اور ایک ہفتہ بعد یہ اعلان کر دیا کہ کویت عراق کا ایک حصہ ہے ساتھ ہی اس نے سعودی عرب کی سرحدوں کی طرف پیش قدمی بھی شروع کر دی۔ صدام کی ہوس کشور کشائی اور عرب دنیا کا ہیرو بننے کے جنون نے ایک بار پھر رنگ دکھایا۔ لیکن اس مرتبہ اس کے قریبی دوست اور مددگار اس کا نشانہ بنے۔ امام امت ؒ نے ایران عراق جنگ کے تیسرے سال ہی علاقہ کے خلیجی ممالک کو تنبیہ کرتے ہوئے صدام کی خصلت سے انھیں آگاہ فرمایا تھا:۔

"تمام ملکوں خصوصاً علاقہ کی حکومتوں کی خیر و صلاح اسی میں ہے کہ صدام کی بلند پرواز اور کینہ جو خواہشات کی تکمیل، نیز تسلط طلب اور منفعت پرست طاقتوں کی خاطر جنھوں نے صدام کو تباہی کے جال میں گرفتار کر رکھا ہے، خود کو دنیوی ہلاکت اور اخروی عذاب الیم میں مبتلا نہ کریں۔۔۔۔ اور صدام عفلقی کی جنون آمیز حرکتوں اور اس کے بدترین انجام سے عبرت حاصل کریں اور یہ جان لیں کہ اگر خدا نخواستہ طاقت، جاہ طلب صدام کے ہاتھ میں آ گئی تو وہ ان کے ساتھ اسرائیل سے بہتر سلوک نہ کرے گا اور اس وقت یہ حکومتیں پشیمان ہوں گی کہ وہ ایک دوسرے اسرائیل یا اس سے بھی بدتر کے پھندے میں گرفتار ہو گئی ہیں۔" (یکم اپریل ۱۹۸۲ء)

اور ہوا بھی یہی، آج اس واقعہ نے دنیائے عرب میں کھلبلی مچا دی ہے، اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس زنگی مست پر کیسے قابو پایا جائے جس کے ہاتھ میں خود انہوں نے تلوار تھمائی تھی اور اب وہی اس کی زد میں ہیں۔ کل عرب ممالک کے رجعت پرست سربراہوں اور ان کے آقاؤں کے لئے یہ بات بڑی خوش آیند تھی کہ صدام ان کے حریف یعنی ایران اور اسلامی انقلاب سے جنگ کر رہا ہے۔ اسے سر سے پاؤں تک مسلح کیا اور اس کی جارحیت کو سراہتے رہے اور آج جب اس آگ نے ان کے گھروں کا رخ کیا ہے تو یہ سراسیمہ بے سروپا حرکتیں کرتے پھر رہے ہیں۔

صدام کی اس نئی جارحیت کی مخالفت علاقہ میں سب سے پہلے اسلامی ایران نے کی، اس نے اپنے اسلامی اصولوں اور بین الاقوامی قوانین کی رعایت کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کویت پر عراقی حملہ اور قبضہ کی مخالفت کی، حتیٰ صدام کی طرف سے ۱۹۷۵ء کی متنازعہ قرارداد کے تسلیم کئے جانے اور ایران کی حق آفریں فتح عظیم کے بعد بھی اس کے اصولوں میں کوئی لوچ نہیں آیا ہے۔

اقوام متحدہ نے بھی کویت پر عراقی حملہ کی سخت مذمت کی اور شاید دنیا نے پہلی بار دیکھا کہ اس حساس موقع پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے عراق کے خلاف دھڑا دھڑ قرار دادیں پاس کیں اور اپنی مستعدی! کا بھرپور ثبوت دیا، یہ یقیناً ایک لمحۂ فکریہ ہے، کیونکہ یہی صدام جب اسلامی ایران کے خلاف تمام بین الاقوامی قوانین کا مضحکہ اڑاتے ہوئے حتیٰ ایران کے بے گناہ عوام، اسکولوں اسپتالوں اور شہری آبادیوں کو بھی اپنے بموں میزائیلوں اور کیمیاوی گیسوں کا نشانہ بنا رہا تھا تو ایران کی مسلسل فریاد پر نہ اقوام متحدہ اور نہ سلامتی کونسل کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی!! اور اس کی وجہ بھی واضح ہے، کل صدام امریکہ اور عالم استکبار کے مفاد میں اسلامی انقلاب کو نابود کرنے پر کمر بستہ تھا اور آج اس علاقہ میں خود امریکی مفادات خطرہ میں ہیں!!!

عرب سلاطین وحکام نے صدامی جارحیت سے محفوظ رہنے کے لئے دنیا کے سب سے بڑے جارح اور شیطان اکبر امریکہ کو دعوت دیکر اسے علاقہ میں لشکر کشی کرنے اور پیر جمانے کا سنہرا موقع فراہم کر دیا ہے، اور سب تو سب سعودی دربار کے سب سے بڑے ملا "بن باز" اور مصر کے شیخ الازہر "جاد الحق" بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے، انہوں نے امریکی اور یورپی فوجوں کا استقبال کرتے ہوئے ان کی حمایت میں فتوے بھی دے ڈالے۔ پتہ نہیں ان کے فتوؤں کے مقابل قرآن کریم کا یہ حکم

عالم اسلام میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

"یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا الیہود والنصاریٰ اولیاء"

اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا مددگار نہ بناؤ۔ (مائدہ/۵۱)

امریکہ نے بھی اس موقعے سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور لاکھوں کا عظیم لشکر ہزاروں ٹینک، توپیں، اور بمبار طیارے اور درجنوں دریائی جنگی جہاز سعودی عرب، خلیج فارس اور بحر احمر کے علاقوں میں تعینات کر دیے، ساتھ ہی نیٹو کے ممبر تمام مغربی ممالک امریکہ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی فوجیں اور جنگی جہاز لے کر علاقہ میں آدھمکے ہیں۔ مزید برآں کئی عرب اور مسلم ممالک نے بھی صدام کے خلاف اپنی فوجیں سعودی عرب روانہ کر دی ہیں۔ کل ملاکر دوسری جنگ عظیم کے بعد کسی ملک کے خلاف امریکہ اور مغرب کی یہ سب سے بڑی لشکر کشی ہے۔ صورت حال دھماکہ خیز ہوتی جا رہی ہے اور عصر حاضر کی سب سے بھیانک جنگ کے امکانات لمحہ بلمحہ بڑھتے جا رہے ہیں۔

عرب دنیا میں اس وقت زبردست خلفشار ہے، عربیت کا نشہ ہرن ہو چکا ہے، امریکی نوکروں کے چہرے یکے بعد دیگرے کھلتے جا رہے ہیں۔ امریکہ نے بھی خلیج فارس اور سعودی عرب میں جم کر بیٹھنے اور دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخیروں پر اپنے پنجے گاڑ کر بیٹھنے کے عندیے دینا شروع کر دیئے ہیں۔ یورپ مغرب کی لشکر کشی کا سرسام آور خرچ جس کا تخمینہ بھی اب مشکل ہوتا جا رہا ہے ان ہی شیوخ نے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا ہے جو اپنے عوام کی تیل کی دولت خود اپنی حفاظت کے لئے دونوں ہاتھوں سے اپنے آقاؤں کے قدموں پر لٹا رہے ہیں جبکہ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ امریکہ کو خود ان سے نہیں، اپنے مفادات اور تیل سے محبت ہے! اسلامی ایران کے صدر جمہوریہ جناب رفسنجانی کے بقول "اس وقت خلیج فارس اور علاقہ میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے یہ ایک خزانہ پر قبضہ کی جنگ ہے" لیکن عرب حکام کو جلد ہی اس کا احساس ہو جائے گا کہ انہوں نے چھوٹے جارح سے بچنے کے لئے بڑے جارح کو بلا کر کتنی بڑی بھول کی ہے۔ کل انہوں نے صدام کی بے دریغ مدد کی جس کے نتیجہ میں آج علاقہ میں ایک آگ لگی ہوئی ہے اور اگر یہ بھڑک اٹھی تو یہ سب اس میں جل کر راکھ ہو جائیں گے۔

●

اس بھیانک ڈرامہ کا ایک رخ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ ایران کے قائم مقام وزیر خارجہ جناب علی محمد بشارتی کے بقول کئی ہفتوں سے یہ گمان کیا جا رہا تھا کہ عراق کویت پر حملہ کرنے والا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ

امریکی صدر جارج بوش نے کویت پر عراقی حملہ کے بعد اپنے پہلے بیان میں کسی حیرت و تعجب کا اظہار نہیں کیا جس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ عراق نے کویت پر حملہ امریکی ایماء پر یا اس کے بھڑکانے میں آکر کیا ہے اور اس کی چند دلیلیں بھی ہیں:-

۱۔ صدام کے غرور و انانیت کا سر کچلنے کے لئے، کیونکہ امریکہ، اسلامی ایران سے ٹکرلنے والا صدام چاہتا ہے، اسے اپنے نوکروں کے دشمن صدام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، لہٰذا یہ حملہ اس کے لئے ایک جال ثابت ہوتا کہ بین الاقوامی سطح پر لے بری طرح ذلیل کر کے کویت سے نکلنے پر مجبور کیا جائے اور اس کا سارا غرور خاک میں مل جائے۔ (جو امریکہ چاہتا ہے)

۲۔ جب علاقہ کی حکومتوں نے دیکھ لیا کہ کویت پر عراق کا قبضہ ہوگیا اور نہ خلیج فارس کے ممالک کی باہمی تعاون کمیٹی اور نہ عرب اتحاد کسی سے کچھ نہ بنی تو انہوں نے اپنے تحفظ کے لئے علاقہ کے سارے کلیدی مراکز امریکہ کے حوالہ کر دیئے اور خود کو امریکہ کی جھولی میں ڈال دیا۔ (جو امریکہ چاہتا تھا)

۳۔ اوپک کی بڑھتی ہوئی طاقت اور تیل کے بازار پر اس کی گرفت کو دیکھتے ہوئے امریکہ اور یورپ سخت الجھن کا شکار تھے اور چونکہ خلیج فارس میں دنیا کے تیل کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور مغرب بہرحال اس کا محتاج ہے لہٰذا اس حملہ سے اسے علاقہ میں تیل کے ذخیروں پر اپنے پنجے گاڑنے کا پورا موقع مل جائے۔ (جو امریکہ چاہتا ہے)

بہرحال ایک بات بالکل مسلّم ہے کہ خلیج فارس میں پیدا ہونے والے اس دھماکہ خیز بحران اور اس سے ہونے والی تباہیوں کا براہ راست اور سب سے زیادہ فائدہ امریکہ اور اسرائیل کو پہنچے گا اور سچ تو یہ ہے کہ موجودہ غبار آلود فضا کے اس پار ہمیں پورے عالم اسلام کا مستقبل تاریک اور اسرائیل کا دیرینہ خواب پورا ہوتا نظر آتا ہے۔

●

بحران خلیج فارس کے پس منظر میں تاریخ کا ایک اور عظیم واقعہ رونما ہوا یعنی صدام حسین نے اچانک ۱۹۷۵ء کے معاہدہ کو تسلیم کرتے ہوئے قرارداد نمبر ۵۹۸ کی شرطوں کو عملی جامہ پہنانے کا اعلان کر دیا اور اپنی طرف سے پہل کرتے ہوئے اس نے اعلان کیا کہ ۱۷ اگست ۱۹۹۰ء سے اس کی فوجیں ایرانی علاقہ خالی کر رہی ہیں اور ۱۷ اگست سے ہی عراق کی جانب سے جنگی قیدیوں کی پہلی کھیپ رہا کی جا رہی ہے۔

یہ واقعہ عالمی سیاسی دنیا میں ایک زبردست دھماکہ تھا۔ ساری دنیا نے بین الاقوامی سطح پر اسے عراق کی زبردست شکست اور اسلامی جمہوریہ ایران کی بے مثال فتح و کامیابی قرار دیا۔ یقیناً یہ ہماری فتح ہے ہمارے اقدار کی فتح ہے، ہمارے ایمان کی فتح ہمارے صبر و استقامت کی فتح ہے ہماری دلیریوں کی فتح ہے ملت ایران کی جاں بازیوں کی فتح ہے ہمارے جذبہ شہادت کی فتح ہے اور ظلم و شقاوت کی شمشیروں پر ہمارے سیل خون کی فتح ہے۔ ہم کل بھی کامیاب تھے جب موت سے گلے مل رہے تھے اور آج بھی کامیاب ہیں جب اس عظیم فتح کے بعد اپنے آزاد شدہ عزیزوں کو گلے لگا رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ ملت اسلام و قرآن کی عید ہے اور ہم عالم اسلام کو اسلام و قرآن کی اس عظیم فتح پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اسلامی انقلاب کے رہبر امام خمینی قدس سرہ نے ایران عراق جنگ کے دوران ہی کامل یقین و اعتماد کے ساتھ ہمیں ہماری فتح کا مژدہ سنا دیا تھا "ما در جنگ پیروزیم و ہیچ شکی در آن نیست" یعنی ہم جنگ میں فاتح و کامیاب ہیں اور اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے"۔

اور دنیا نے دیکھا کہ ہم ہر جہت سے کامیاب سرخ رو ہوئے۔ آج سے دس سال قبل امریکہ کے ایماء پر صدام نے جن بنیادوں کو بہانہ بنا کر جنگ چھیڑی تھی، اسلامی سرزمین پر قبضہ کرنا چاہا تھا، اسلامی انقلاب کا دم اس کے گہوارہ میں گھونٹنا چاہا تھا اور اس مقصد کے لئے اس نے بین الاقوامی اصولوں کا مضحکہ اڑاتے ہوئے ۱۹۷۵ء کے معاہدہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور انسانی حقوق کو بے شرمی کے ساتھ قدموں تلے روندتے ہوئے ہزاروں لاکھوں بے گناہ انسانوں، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو اپنے بموں، میزائیلوں اور کیمیکل گیسوں کا نشانہ بناڈالا تھا ..... اس کے مقابل ایران نے اپنے خداداد انقلابی اصولوں کی روشنی میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے موقف سے منہ نہ موڑا۔ آخرکار عراقی سفاک و جلاد حکومت نے اسلام اور اہل اسلام کی انقلابی قوت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے، آج بحمد اللہ عراقی فوجیں اسلامی سرزمین سے واپس جاچکی ہیں اور دونوں طرف کے جنگی قیدیوں کا ایک بڑا حصہ اپنے اپنے وطن واپس ہوچکا ہے۔

ہماری یہ فتح و کامرانی قائدامت امام خمینیؒ کی پیغمبرانہ قیادت اور ان کے روحانی فرزند حضرت آیت اللہ خامنہ ای کی مدبرانہ رہبری کی رہین منت ہے اور یہی وجہ ہے کہ خوشی کی ان گھڑیوں

میں امام امت رہ کے فراق کا غم انگیز احساس اور بڑھ گیا ہے۔ کاش! آج امام رہ ہمارے درمیان موجود ہوتے… لیکن ہمیں یقین ہے کہ قائد امت رہ ہماری فتح و مسرت کے شاہد و ناظر ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ خداوند عالم نے اپنے لطف خاص سے ہم کو وہ بے مثال قائد و رہبر عطا فرمایا تھا جس کی پوری زندگی پیغمبر اکرم ص کی سیرت طیبہ کا آئینہ تھی، جس کی جنگوں میں صدر اسلام کی جنگوں کا جوش و جذبہ تھا اور جس کی صلح "فتح مبین" کا سرچشمہ بنی۔ کل صلح حدیبیہ کو شک و شبہ اور اسلام کے لئے ذلت کی نظر سے دیکھنے والی دنیا نے ٹھیک دو سال بعد فتح مکہ جیسی عظیم کامیابی کا مشاہدہ کیا تھا، اسی طرح قائد امت رہ کی طرف سے اقوام متحدہ کی قرارداد صلح ۵۹۸ تسلیم کئے جانے کو ایران و اسلام کی شکست و ذلت بتانے والوں نے آج دو ہی سال کے بعد حیرت و استعجاب سے اسلامی ایران کی فتح عظیم میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔

خدا ہمیں ان کی راہ پر گامزن رکھے۔ انہوں نے بارہا مختلف موقعوں پر فرمایا تھا کہ ملت اسلام ہمیشہ سربلند رہ سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ دنیاوی طاقتوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خدا کی قدرت پر اعتماد کرے اور باہم متحد ہو۔

خلیج کے موجودہ بحران کا سب سے واضح حل بھی یہی ہے کہ تمام مسلمان عرب اور غیر عرب ممالک محکم قرآن کی روحانی آواز: "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا" پر لبیک کہیں اور اپنے علاقہ کے مسئلہ کو خود حل کرنے کے لئے قدم اٹھائیں۔ عراق اپنی فوجیں کویت سے واپس بلائے اور امریکہ مع اپنے لاؤ لشکر کے خلیج فارس سے چلا جائے تاکہ حرم الٰہی مکہ معظمہ اور حرم رحمۃ للعالمین مدینہ منورہ پر چھائے ہوئے کفر و الحاد کے یہ کالے بادل چھٹ جائیں اور یہ سب کچھ ناممکن بھی نہیں ہے، شرط یہ ہے کہ اتحاد و یگانگت کی دعوت دینے والے پیغمبر اعظم ص کی امت ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرے۔

ماہ ربیع الاول میں حضور سرور کائنات ص کی ولادت باسعادت کے مبارک ایام میں رہبر انقلاب اسلامی امام خمینی قدس سرہ نے "ہفتہ وحدت" کی داغ بیل ڈالی تھی اور پورے عالم اسلام کو کفر و الحاد کے خلاف ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی دعوت دی تھی۔ ہمارا فریضہ ہے کہ اس عظیم رہبر اسلام کی دعوت پر لبیک کہیں اور متحد ہو کر اپنے مسائل کا حل خود تلاش کریں۔ آج اسلام کے مقدس و متبرک مقامات، کفر و الحاد کے لشکروں کے نرغے میں ہیں۔ اب تک سعودی حکام کے زیر سایہ مسلمان جیسے تیسے حج جیسی عظیم عبادت میں شرکت کرتے رہے، مار دھاڑ اور قتل و غارت کے باوجود یہ سلسلہ اب تک جاری رہا۔ اب بھی اگر مسلمانوں کو ہوش نہ آیا تو موجودہ صورت حال میں اس عبادت اور ان مقامات مقدسہ کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔

جناب سید مرتضیٰ حسین صدرالافاضل ؒ

تفسیر

سورۂ نساء آیت نمبر ۴۰ ۔ ۴۲

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ ۚ وَ اِنۡ تَکُ حَسَنَۃً
یُّضٰعِفۡہَا وَ یُؤۡتِ مِنۡ لَّدُنۡہُ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۴۰﴾ فَکَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا
مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍۭ بِشَہِیۡدٍ وَّ جِئۡنَا بِکَ عَلٰی ہٰۤؤُلَآءِ شَہِیۡدًا ﴿۴۱﴾ یَوۡمَئِذٍ
یَّوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ عَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰی بِہِمُ الۡاَرۡضُ ؕ
وَ لَا یَکۡتُمُوۡنَ اللّٰہَ حَدِیۡثًا ﴿۴۲﴾

ترجمہ:

بلاشبہ، اللہ عزاسمہ کسی پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا۔ اگر کوئی نیکی کرے تو اللہ اسے دوگنا کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے (۴۰) (سوچو) اس وقت کیا حالت ہوگی، جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے محمدؐ) آپ کو ان سب پر گواہ لائیں گے (۴۱) اس دن ۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور رسول کی نافرمانی کی، یہ چاہیں گے کہ وہ پیوند خاک ہو جاتے، وہ اللہ جل جلالہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے (۴۲)

تفسیر:

۴۰۔ ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ ....

راہ خدا میں مال خرچ کرنے، اور بھلائی کے کام کرنے والوں کو اطمینان رکھنا چاہئے کہ اللہ عزّ اسمہ، رحیم و رحمٰن ہے وہ کسی کو اس کے عمل کا بدلہ کم نہیں دیتا، کسی پر ذرا سا ظلم روا نہیں رکھتا وہ ہر عمل خیر کا بدلہ بڑھا چڑھا کر دے گا۔ پھر اپنے حضور سے مزید بڑے بڑے ثواب مرحمت فرمائے گا

۴۱۔ فکیف اذا جئنا من کلّ امّۃٍ ....

میدانِ حشر میں ساری مخلوق موجود ہوگی اس وقت کے لئے کچھ اعمالِ صالحہ جمع کر لینا چاہئے وہ سفر کی آخری منزل اور جزا و سزا کا طویل ترین لمحہ ہوگا، ہر ایک کا اعمال نامہ اس کے ہاتھ میں اور رسول، نبی یا امام اپنی امت کے ساتھ حضور الٰہی میں لایا جائے گا۔ اور ان سب معصوم گواہوں پر حضرت خاتم الانبیا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بطور گواہ کل سب کے آگے ہوں گے، ان کے پیچھے امتِ وسط کا ایک معصوم گروہ یعنی ائمۂ اطہار علیہم السلام، ان کے عقب میں مسلمان امت ان کے عقب میں انبیا و مرسلین اپنے اپنے عہد کے لوگوں کو لئے ہوں گے۔

شفیع و شہید

سورۃ البقرہ، آیت/۱۴۳، النحل/۸۹، الحج/۷۸، النساء/۶۹ اور آل عمران کی آیت/۸ سے جو باتیں واضح ہوتی ہیں ان میں سے ایک اہم بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بارہ امام اعمال امت سے ہمہ وقت باخبر رہتے ہیں اور ان کے شہید ہونے کا مفہوم بھی یہی ہے اور اسی بنیاد پر انھیں حق شفاعت عطا ہوا ہے۔

حدیث

الکافی میں ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے "فکیف اذا جئنا من کلّ امّۃ ....." کی تفسیر میں فرمایا: یہ آیت امتِ مسلمہ کے بارے میں اتری ہے، اس امت کے ہر دور میں ہم میں سے ایک امام ہوگا وہی امت کا شاہد ہوگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ، ہم پر گواہ ہوں گے۔

اعملوا فسیری اللہ عملکم و رسولہ والمؤمنون" توبہ آیت/۱۰۵ کی

تفسیر واضح یہی ہے کہ خاص مومن یعنی ائمہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گواہی مسلم ہے

۴۲ ۔ یومئذ یو دّ الذین کفروا .....

حشر کے دن گناہوں کی فہرست اور گواہوں کی صورت دیکھ کر، اللہ کے منکر اور پیغمبر کے نافرمان کہیں گے، زمین پھٹے اور وہ اس میں چلے جائیں، زمین انھیں یوں چھپالے کہ نشان قبر باقی نہ رہے تاکہ کھلی رسوائیوں سے بچ جائیں۔ مگر یہ خیالات ان کو مزید دکھ دیں گے، اب وہ کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔ نامۂ اعمال میں ان کے شرک و کفر و نافرمانی کا کچا چٹھا لکھا ہوگا، گواہ سامنے ہوں گے، عالم الغیب و الشہادۃ اللہ عزّوجل محاسب ہوگا۔ مرد مومن، ہمہ وقت ایسے لمحات کی یاد میں توبہ اور اللہ سے رجوع رکھتا ہے۔ یہی طریق تقویٰ اور راہِ نجات ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا
الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا
إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا ۚ وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ
أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً
فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ
كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿۴۳﴾

ترجمہ:

اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو! نماز کے قریب نشے کی حالت میں نہ جاؤ تاکہ تم کو یہ معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اور نہ جنابت کی حالت میں مگر یہ کہ سفر کر رہے ہو یہاں تک کہ غسل کر لو۔ اور اگر بیمار ہو یا مسافر یا بیت الخلا سے فارغ ہو کر آئے ہو۔ یا بیویوں سے مباشرت کی ہو، پھر تم کو پانی نہ ملے۔ تو پاک مٹی کا قصد کرو۔ اور مسح کرو۔ اپنے چہرے اور ہاتھوں کا۔ یقیناً اللہ معاف کرنے، بخشنے والا ہے (۴۳)

تفسیر

لاتقربوا الصّلوٰۃ وانتم سکاریٰ . . . . .

نمازُ دین کا ستون ہے، اس بنا پر اس فریضے کی انجام دہی میں اہتمام واجب ہے۔ اس اہتمام میں ایک بات یہ ہے کہ نشے کی حالت میں نماز ادا نہ کی جائے۔ نشہ ممنوع ہے کہ نماز میں اظہار بندگی، اقرار توحید اور سراپا عاجزی کا بیان اگر زبان کے ساتھ عقل وفکر کی ہم آہنگی نہ ہو تو نماز کا مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ نماز میں جو کچھ کہا اور پڑھا ہے وہ بقائمی ہوش وحواس پڑھنا چاہیے کہ تزکیہ نفس حصول قرب کا مدعا حاصل ہو سکے۔ یہ آیت حرمت شراب کیلئے سند ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت دو سو انیس میں شراب کو مذمت میں جوے کا شریک کیا اور سورۃ المائدہ / ۹۰ میں شراب سے اجتناب کو واجب اور حرمت شراب کو حتمی کردیا۔

حلبی نے امام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو امام نے " سُکر " کے معنی بتائے "سکر النوم" مطلب یہ ہے کہ اونگھ اور نیند کی زیادتی تمہیں تکبیر و رکوع وسجود میں سمجھنے نہیں دیتی کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ خیال غلط ہے کہ مومن شراب میں مست ہو سکتے ہیں۔ مومن تو نشہ آور چیز نہ پیتا ہے نہ وہ نشے میں رہتا ہے۔ (تفسیر عیاشی)

الکافی میں ایک باب ہے " انّ الخمر لم تزل محرّمۃ " شراب ہمیشہ حرام رہی ہے اس ضمن میں کلینی رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد احادیث نقل کیے ہیں۔ اور ڈاکٹر فرانسس ویکفلڈ نے شواھد اسلامیہ و مسیحیہ و یہودیہ میں تورات وانجیل کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ شراب گزشتہ امتوں میں حرام تھی۔ نیز دیکھئے کتاب " امثال سلیمان نبی۔ کتاب " اشعیا نبی " اور " انجیل لوقا "

— ولاجنباً الاّعابری سبیل — اس سے فقہا نے دو حکم معلوم کئے ہیں۔

(الف) جنب کی حالت میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے، ایسے شخص پر نماز سے پہلے غسل کرنا واجب ہے۔

(ب) جنابت کی حالت میں مسجد کے اندر داخلہ حرام ہے۔ لا تقربوا - یعنی - ولاتدخلوا جنباً فی الصّلوٰۃ الاّعابری سبیل — اور صلوٰۃ سے مراد مسجد ہے اصلاً اور حقیقتاً یا مظروف سے ظرف یعنی نماز سے مکان نماز مراد ہے۔ تفسیر کا یہ نکتہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ مسجد نبی میں کھلنے والے سب دروازے بند کرنے کا حکم آنحضرتؐ نے جاری فرما دیا صرف اپنا اور حضرت علیؑ کا دروازہ کھلا رہنے کی اجازت دی کہ اللہ عزّ وجل کی رضا یہی تھی۔

۔ حتیٰ تغتسلوا ۔ جو شخص جُنُب ہو وہ سفر کی حالت میں بھی بلا غسل جنابت کئے نماز نہ پڑھے۔ یا مجنب افراد غسلِ جنابت کرنے کے بعد ہی مسجد سے گزر سکتے ہیں۔ دیکھیے المائدہ/۶ آیت میں ۔ صلوٰۃ ۔ ایک جملے میں دو معنوں میں استعمال ائمہ اہل بیتؑ اور دوسرے مفسرین کی توضیح و تعیین کی بنا پر جائز ٹھہرا ہے۔

۔ وان کنتم مرضیٰ او علیٰ سفر ۔ نماز پڑھنا ہو اور بیماری کی بنا پر پانی کا استعمال نقصان دہ ہو یا سفر میں پانی دستیاب نہ ہو ان صورتوں میں تیمم کی اجازت ہے۔

۔ اوجاء احد منکم من الغائط ..... رفع حاجت کرکے آنا۔ نہایت اعلیٰ استعارہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وضو یا غسل کی حالت تھی اور رفعِ حاجت کی ضرورت پڑی یا لمسِ نساء ۔ مباشرت کرلی اس کے بعد نماز کا وقت آگیا اور نماز پڑھنا چاہی، لیکن رفع حاجت کرنے والے کو وضو کے لئے اور مباشرت کرنے والے کو غسل کے لئے پانی میسر نہ ہو تو ان دونوں کو تیمم کی اجازت ہے۔

تیمّم

۔ فتیمموا صعیداً طیبًا، فامسحوا بوجوھکم۔

"تیمم، لغت میں" قصد کرنا " اور اصطلاحِ شرع میں معیّن طریقے سے ہاتھ اور چہرے پر مٹی سے مسح کرنا ہے۔

۔ صعید ۔ خاک یا سطحِ زمین۔

"بوجوھکم" میں "ب" کچھ اور لبعض کے معنوں میں ہے۔ یعنی چہرے اور ہاتھوں کے لبعض حصے۔ یہ لبعض حصے حدیث سے معیّن ہوتے ہیں۔ تیمم کے بارے میں پوری گفتگو سورہ مائدہ کی چھٹی آیت میں ہوگی۔ یہاں، تیمم کے طریقے کا سادہ بیان درج ہے۔

نیت کے ساتھ، دونوں ہتھیلیوں کو انگلیاں ملا کر خاک پر مارنا، پھر خاک جھاڑ کر، بالوں کے اُگنے کی جگہ سے بھوؤں اور دونوں کنپٹیوں کے درمیان یوں پھیرنا کہ پوری پیشانی پر دونوں ہتھیلیوں کے آخری حصّے مسح کریں، اس میں ناک کا بالائی حصہ بھی آجائے۔ پھر داھنے ہاتھ کے گٹے سے لے کر ناخنوں کے سرے تک پشت دست اور اس کے بعد سیدھی ہتھیلی سے الٹے ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت پر کلائی سے ناخنوں کے کنارے تک مسح کرے۔ مسح کے وقت پیشانی اور جس ہاتھ کا مسح کرنا ہے اسے ہلنا نہ چاہیئے۔

— ان اللہ کان عفواً ... — اللہ تعالیٰ رحیم وکریم ہے وہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے، بندے کو اس کے عفو و غفران سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔

غبار آلود، ہاتھ اور منہ عاجزی کا بہترین اظہار ہے۔ پیشانی پر خاک علامت ہے کہ بندہ حضور الٰہی میں رحمت طلبی کو حاضر ہے۔

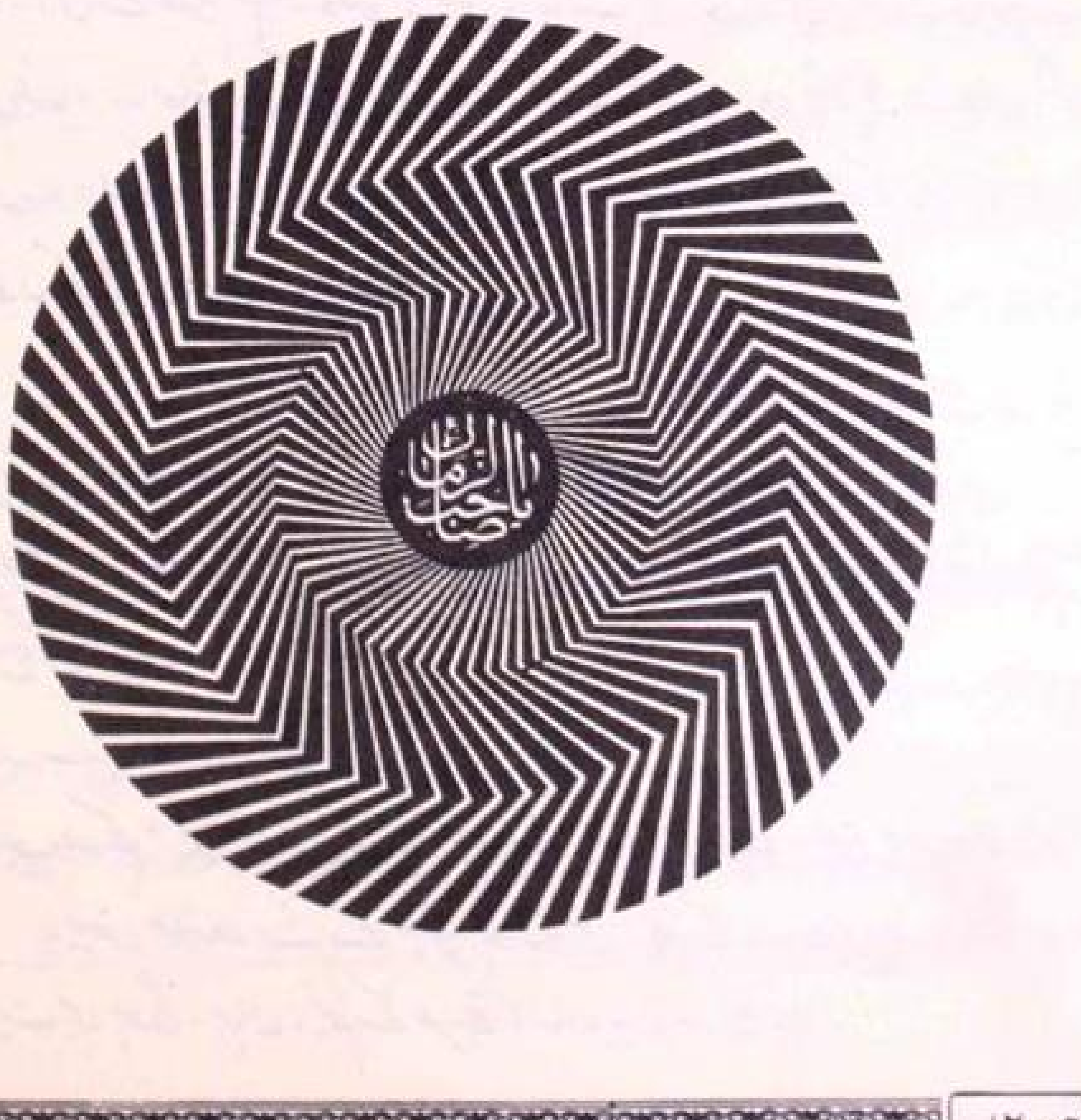

حضرت عیسیٰؑ

شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

عیسائیوں کے درمیان مشہور تاریخ کے مطابق حضرت عیسیٰ ۱۹۸۱ سال پہلے[1] فلسطین کے ایک شہر "بیت اللحم" میں پیدا ہوئے تھے۔ البتہ خود بعض عیسائیوں کی تحقیق کے مطابق یہ تاریخ قطعی نہیں ہے۔ اس میں اصل تاریخ سے پانچ سال یا اس سے بھی زیادہ کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ نے فلسطین کی فضا میں آنکھ کھولی جو اس زمانہ میں سلطنت روم کے زیر تسلط تھا۔ اس سلطنت میں جنگ و جدال، طاقتوں کا ٹکراؤ، زور و زبردستی، گہرے طبقاتی اختلافات اور انواع و اقسام کی بت پرستیاں رائج تھیں اور اگرچہ دین یہود ان علاقوں میں پایا جاتا تھا، لیکن اسے قانونی اور حکومتی دین کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ مزید یہ کہ خود یہودی بھی بہت سی گمراہیوں میں مبتلا تھے۔ دنیا پرستی، سود خوری، دھوکہ، چالبازی، کینہ و انتقام، خرافات پھیلانا، خود دینی پیشواؤں کا دین کو تحریف کرنا اور بے چارے عوام کا مال ہڑپنا نیز پیغمبروں کو قتل کرنا۔ مختصر یہ کہ دنیا طلبی ظلم و تعدی، کمزوروں کے حقوق کی پامالی اور جنگ و جدال اس زمانہ کی خصوصیات میں سے تھے ایسے ماحول میں اخلاقی و معنوی دعوت کی سخت ضرورت تھی جو لوگوں کو شرافت اور صفا و محبت کی فضا سے روشناس کرے۔ چنانچہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰ کو بھیجا۔ ذیل میں ہم حضرت عیسیٰؑ اور عیسائیت کو قرآنی نقطہ نگاہ سے پیش کرتے ہیں۔

---

[1] یہ مقالہ آج سے تقریباً ۱۰ سال قبل لکھا گیا ہے (مترجم)

عیسیٰ قرآن کی نظر میں

خود حضرت عیسیٰ کی ولادت گویا ایک معجزہ تھی۔ سورۂ مریم کی آیت ۱۵ کے بعد ارشاد ہے:۔

(اے رسول) اس کتاب میں مریم کو یاد کرو۔ جب وہ اپنے عزیزوں کے پاس سے مشرق کی جانب ایک مقام پر گئیں اور لوگوں سے الگ ہو کر اپنے اور ان کے درمیان حجاب قائم کر لیا اور ہم نے اپنی روح کو ان کے پاس بھیجا جو ان کے سامنے ایک کامل اور آراستہ انسان کی شکل میں نمودار ہوا۔ مریم نے کہا: اگر تو پرہیزگار ہے تو میں تجھ سے خدائے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں۔ اس نے کہا میں تمہارے پروردگار کا پیغامبر بن کر آیا ہوں تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ پسر عطا کروں۔ مریم نے کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں صاحب اولاد ہو جاؤں جب کہ مجھے کسی مرد نے چھوا تک نہیں اور نہ میں بدکار ہی ہوں۔ اس نے کہا ایسا ہی ہے۔ تیرے پروردگار نے کہا ہے کہ یہ بات میرے لئے آسان ہے تاکہ ہم اسے پیدا کر کے لوگوں کے لئے اپنی قدرت کی نشانی اور رحمت قرار دیں۔ اور یہ امر طے شدہ ہے۔ (غرض) مریم حاملہ ہوئیں اور لوگوں کی نگاہوں سے دور ایک الگ جگہ چلی گئیں۔ پھر دردزہ نے انہیں کھجور کے ایک سوکھے درخت کے تنے تک پہنچا دیا اور انہوں نے کہا: اے کاش میں اس سے پہلے مرگئی ہوتی اور لوگ مجھے بھول جاتے ....." تا آخر۔

بعد کی آیات میں حضرت عیسیٰ کی ولادت، جناب مریم کے عزیزوں کی ان کو شماتت و طعنہ زنی اور گہوارہ میں حضرت عیسیٰ کے کلام کرنے کا تذکرہ ہے۔ اس طرح بلاشبہ جناب مریم کا حمل بلا کسی آمیزش کے وجود میں آیا۔ اب ہم نہیں جانتے کہ اس واقعہ کو ایک کنواری (پاکیزہ) خاتون کا ماں بننا قرار دیں یا معجزہ کہیں۔ بہر حال قرآن نے جناب مریم کے دامن کو ان تمام اتہامات و الزامات سے پاک و بری قرار دیا ہے جو یہودی ان پر لگاتے تھے کہ حتیٰ عیسائیوں کے بعض آثار و کتب میں بھی اس کا اشارہ ملتا ہے۔ اور یہ قرآن کی جانب سے خود جناب مریم اور عیسائی دنیا کی ایک بڑی خدمت ہے۔

حضرت مریم کی شخصیت: قرآن کریم جو حق کو بیان کرنے اور خرافات و تحریفات کو دور کرنے

کے لئے نازل ہوا ہے، اس نے انبیاء کرامؑ اور ان سے وابستہ دیگر شخصیتوں کا بہترین انداز میں ذکر کیا ہے۔ منجملہ ان کے مریمؑ کے بارہ میں یہ فرماتا ہے :۔

"وہ جس کا دامن آلودگیوں سے پاک رہا، ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اسے اور اس کے فرزند کو دنیا والوں کے لئے نشانی قرار دیا" (انبیاء / ۹۲)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے :۔

"اور مادر عیسیٰ صدیقہ و راستگو تھیں" (مائدہ / ۷۸)

ایک اور جگہ قرآن فرماتا ہے :۔

"جس وقت فرشتوں نے کہا: اے مریم بلاشبہ خدا نے تم کو منتخب فرمایا، پاک، پاکیزہ قرار دیا، اور تمہیں تمام عالمین کی عورتوں میں انتخاب کیا ہے۔ اے مریم! اپنے پروردگار کے حضور خالص عبادت وبندگی کرو، سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ہمراہ رکوع بجالاؤ" (آل عمران / ۴۲ - ۴۳)

مذکورہ بالا تینوں آیتوں سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم پاکدامن، صدیقہ، پاک و پاکیزہ، منتخب پروردگار اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھیں۔ انھیں خدا کی جانب سے بندگی و عبادت کا حکم دیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب عیسائیوں کے پیغمبر جناب عیسیٰ کی ماں اس عظیم مرتبہ پر فائز ہوں تو اس دین کی بنیاد کس قدر باعظمت و استوار ہی ہوگی اور یہ امر کس قدر مایۂ افتخار ہوگا۔

حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت

بہتر ہے کہ قرآن کی چند آیتوں کی روشنی میں حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے :۔

"عیسیٰؑ ابن مریم اللہ کے رسول کے سوا کچھ نہیں ہیں ان سے پہلے کتنے انبیاء دنیا سے جاچکے ہیں ان کی والدہ صدیقہ تھیں۔ دونوں غذائیں کھاتے تھے۔ دیکھو ہم ان کے لئے کس طرح اپنی نشانیاں بیان کرتے ہیں۔۔۔۔" (مائدہ / ۷۸)

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے :۔

بلاشبہ عیسیٰؑ ابن مریم خدا کے رسول اور کلمۃ اللہ ہیں کہ خداوند عالم نے انھیں

مریم کی طرف بھیجا - وہ اللہ کی روح ہیں۔ یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں۔ تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ اپنی اس بات سے پھر جاؤ، یقیناً خدا ایک ہے۔ وہ اس سے منزہ ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے..... "

(نساء / ۱۷۰ - ۱۷۱)

ان آیات سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ ایک انسان اور جناب مریم کے فرزند ہیں۔ وہ اللہ کے فرزند اس کے شریک یا اس کے مانند نہیں ہیں۔ سہ گانہ پرستی یعنی تثلیث کا عقیدہ باطل ہے۔ عیسیٰؑ اللہ کے رسول، کلمۃ اللہ اور اس کی روح ہیں۔

نیز سورۂ مریم آیات ۳۰ - ۳۴ میں ارشاد ہے:۔

" عیسیٰؑ نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے کتاب عطا کی گئی ہے اور مجھے نبی قرار دیا گیا ہے۔ میں جہاں بھی ہوں باعث برکت ہوں۔ مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے کہ جب تک زندہ ہوں انھیں بجا لاؤں اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کا سلوک کروں (خدا نے) مجھے ستمگر اور سخت دل قرار نہیں دیا ہے۔"

اس آیت سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰؑ اللہ کے بندہ ہیں، نہ خود خدا ہیں اور نہ اس کے بیٹے، وہ پیغمبر ہیں، صاحب کتاب اور صاحب دین ہیں، وہ "مبارک" ہیں لہٰذا ان سے کسی کو کوئی ضرر یا نقصان نہیں پہنچا بلکہ وہ مجسم برکت و محبت ہیں (جبکہ اکثر مقامات پر انجیل میں اس کے خلاف ملتا ہے) نیز وہ "جبار و شقی" بھی نہیں تھے، بلکہ اس ماحول میں بھی جہاں خونخوار اور جباروں کی حکومت تھی یا جہاں یہودی پیشوا و علماء ہوس پرست اور دنیا طلب ہو گئے تھے اور دین کی آڑ میں لوگوں کے ساتھ خیانت کرتے تھے، آپ رحم دل، مہربان اور صاحب برکت تھے۔

سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۱۱۰ میں ارشاد ہے:۔

"جب خداوند عالم نے فرمایا: اے عیسیٰ بن مریم! ہم نے تم پر اور تمہاری ماں پر جو نعمتیں نازل کیں انھیں یاد کرو کہ جب ہم نے گہوارہ میں اور ویسے ہی بڑے ہونے کے بعد لوگوں سے کلام کیا اور جب ہم نے تمہیں کتاب و حکمت اور توریت و انجیل

کی تعلیم دی، اور جب تم مٹی سے پرندہ کی شکل بنا کر اس میں پھونکتے تھے تو وہ میرے حکم سے سچ مچ کا پرندہ بن جاتا تھا اور اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے اور مُردوں کو میرے حکم سے قبر سے اٹھا دیتے تھے (یعنی زندہ کر دیتے تھے) ......"

اس آیت میں حضرت عیسیٰ کے مرتبۂ نبوت اور ان کی علمی حیثیت و عظمت کا ذکر کیا گیا ہے ساتھ ہی جو معجزات انہوں نے انجام دیئے ہیں ان کا ذکر بھی ہوا ہے؛ خاص طور سے اس نکتہ پر زیادہ توجہ دی گئی ہے کہ یہ تمام معجزات خدا کے حکم سے انجام پائے ہیں۔ یعنی اگر انہوں نے انسانی قوت و توانائی سے بڑھکر کوئی کام انجام دیا ہے تو یہ ان کا کام نہیں تھا بلکہ یہ قدرت پروردگار تھی۔

بنابریں جناب عیسیٰؑ ایسے پاک و پاکیزہ و صاحب عظمت انسان اور پیغمبر ہیں جو صاحب کتاب، صاحب شریعت اور صاحب معجزہ ہیں۔ مختصر یہ کہ قرآن ان کی رفتار و کردار اور اخلاق و سیرت کا ذکر بھی فرماتا ہے ......

انجیل اور حضرت عیسیٰؑ کی ذمہ داری

سورۂ صف کی آیت ۶ میں ارشاد ہے :۔

"جب عیسیٰؑ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں اور یہ کتاب توریت جو میرے سامنے ہے اس کی تصدیق کرتا ہوں نیز تمہیں ایک ایسے رسولؐ کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آنے والا ہے اور اس کا نام احمدؐ ہوگا۔

سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ تا ۵۱ میں ارشاد ہے :۔

"عیسیٰؑ ابن مریم پیغمبر ہیں جو بنی اسرائیل کی جانب آئے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ میں تمہارے پروردگار کی جانب سے نشانیاں اور معجزے لے کر آیا ہوں ...... اور یہ توریت جو میرے سامنے ہے اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ جو بعض چیزیں تم پر حرام کر دی گئی تھیں انھیں تم پر حلال کر دوں۔ میں تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر نشانیاں لایا ہوں، پس خدا سے ڈرو اور میری

پیروی کرو۔ خدا میرا اور تمہارا پروردگار ہے ، پس اس کی پرستش وعبادت کرو، یہی راہ راست ہے ۔"

نیز سورۂ مائدہ کی آیت ۴۶ ، کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں :۔

" ہم انکے آثار کے بعد عیسیٰؑ ابن مریم کو لائے جو اپنے سامنے موجود توریت کی تصدیق کرتے تھے اور ہم نے انھیں انجیل عطا کی جس میں ہدایت اور نور ہے اور ان کے سامنے موجود توریت کی تصدیق کرنے والی ہے ۔ اور صاحبان تقوا کے لئے ہدایت و نصیحت ہے ۔"

مذکورہ بالا آیات سے ہمیں حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :۔

۱ــــ عیسیٰؑ ابن مریم بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے تشریف لائے اور قوم یہود کے درمیان رائج گمراہیوں کے خلاف جدوجہد ان کی رسالت کی بنیاد و اساس تھی (لیکن جیسا کہ ہم آئندہ پڑھیں گے پیغمبر اسلامؐ تمام عالمین کی ہدایت کے لئے تشریف لائے تھے ۔)

۲ــــ دین عیسائیت توریت اور انجیل میں نازل ہونے والے احکام کا مجموعہ ہے ، یہ دیکھتے ہوئے کہ دین یہود میں جو بعض چیزیں حرام اور عقاب و سزا کی موجب تھیں اس دین میں ان کی حرمت کو برطرف کر دیا گیا ۔ اس طرح جناب عیسیٰؑ کا دین دراصل دین یہود کے دائرہ میں ہی آتا ہے اور اس کی تکمیل کرنے والا ہے ۔

۳ــــ حضرت عیسیٰؑ کی رسالت ظہور اسلام کے ساتھ ہی تمام ہو جاتی ہے ، یعنی حضرت عیسیٰؑ اور ان کا دین ہمیشہ کے لئے انسانیت کے رہبر نہیں ہیں ۔ ساتھ ہی ہمیں قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کی آیتوں میں پیغمبر اسلامؐ کے نام اور ان کی آمد کی خوشخبری کی بھی صراحت موجود تھی اور اگر موجودہ انجیلوں میں ہمیں یہ صراحت نظر نہیں آتی تو ہمیں اس واقعیت اور دوسرے حذف شدہ حقائق کو اصلی انجیلوں میں دیکھنا چاہیئے ۔

۴ــــ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کی اساس توحید اور خدائے واحد کی اطاعت و بندگی رہی ہے ۔ آپ خود کو خدا کا بندہ سمجھتے تھے اور خدا کی پرستش و عبادت کو ہی صراط مستقیم قرار دیتے تھے ۔ (جبکہ کلیسائی مبلغین اس کے خلاف عقائد پیش کرتے ہیں)

۵ ــــ حضرت عیسیٰؑ صاحب اعجاز تھے اور یہ معجزے ان کی دعوت کو صحیح ثابت کرتے تھے۔

٦ ــــ انجیل چند حسب ذیل مطالب پر مشتمل ہے:۔

ہدایت، نور، موعظہ و نصیحت، تقویٰ کی دعوت، اطاعت پروردگار نیز بعض قید و بند اور اسارتوں سے رہائی و آزادی۔

حضرت عیسیٰؑ کا صعود کرنا

عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا انجام ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ نے ۳۰ برس سے ۳۳ برس کی عمر تک یعنی تین سال تک لوگوں کو اپنے دین کی طرف دعوت دی اور دعوت جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، دنیا پرستی اور ظلم و بربریت میں گرفتار ان یہودیوں کو نجات دلانے اور راہ راست پر لانے کے لئے تھی جنھوں نے دین موسیٰؑ میں تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں، دینی رہبروں اور راہبوں نے اپنی من، انی کے ذریعہ دین میں بہت سے خرافات کو جنم اور رواج دے رکھا تھا اور توریت کی تحریف ہو چکی تھی۔ اس لئے حضرت عیسیٰؑ یہودیوں کو اجتماعی و اخلاقی فساد اور گمراہی نیز اعتقادی و مذہبی کج روی سے نجات دلانے کے لئے تشریف لائے تھے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی مخالف بھی یہی قوم تھی۔ بہت تھوڑے سے لوگ آپ پر ایمان لائے اور اگرچہ حضرت عیسیٰؑ کے بے شمار فیوض و برکات اور خدمات، آشکار معجزے اور دلنشین نصیحتیں معاشرہ کے محروم افراد پر بہت گہرا اثر ڈالتی تھیں، لیکن ہوا و ہوس کے پجاری نیز موقع پرست یہودی جو حضرت عیسیٰؑ کی مسالمت آمیز اور روح پرور دعوت کو اپنی دنیا پرستی اور ظلم و ستم کے منافی دیکھ رہے تھے ان کے مقابلہ پر اٹھ کھڑے ہوئے۔

آخر کار ان لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کے قتل کی سازش تیار کی، اور حضرت کی اس قدر برائی و بدگوئی کی کہ حاکم شہر انھیں مجرم قرار دیدے اور ان کے خلاف حکم صادر کر دے...... عیسائیوں کے یہاں یہ مشہور ہے کہ عیسیٰؑ کو بڑی ذلت کے ساتھ گرفتار کیا گیا اور قتل کے مجرموں اور چوروں کے ہمراہ ان کو بھی سولی پر چڑھا دیا گیا۔ یہودی اس قضیہ کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھانے میں کامیاب ہو گئے......

اور یہ بات عیسائیوں کی پوری تاریخ میں مشہور ہوگئی کہ حضرت عیسیٰؑ کے قتل کی ذمہ داری یہودیوں کی گردن پر ہے (اگرچہ ادھر چند صدیوں سے سیاسی مصالح کے پیش نظر کلیسائی حکام کے درمیان یہ بات رائج کی گئی کہ عیسیٰؑ کے قتل کے ذمہ دار یہودی نہیں تھے، تاکہ اس دیرینہ دشمنی کو دور کیا جائے اور مسلمان مخالف معاشرہ میں ان کا اتحاد وسیع تر ہوتا جائے)۔۔۔۔۔۔

لیکن قرآن حضرت عیسیٰؑ کی ظاہری زندگی کے آخری لمحات کے بارہ میں جو کچھ بیان کرتا ہے۔ اسے سورۂ نساء کی آیت ۱۵۷ - ۱۵۸ میں ملاحظہ فرمائیں:۔

"اور یہودی یہ کہتے ہیں کہ ہم نے عیسیٰؑ نبی خدا کو قتل کر ڈالا جبکہ نہ انہوں نے انھیں قتل کیا ہے اور نہ انھیں سولی دی ہے بلکہ یہ امر ان کے لئے مشتبہ ہوگیا ہے۔ یقیناً جو لوگ عیسیٰؑ کے بارے میں اختلاف کا شکار ہوئے۔ اس (عیسیٰؑ) کی نسبت دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں کوئی علم یا کوئی خبر نہیں رکھتے۔ بس اٹکلیں لگاتے ہیں، یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا ہے۔ بلکہ خدا نے انھیں خود اپنی طرف اٹھالیا ہے۔ خدا زبردست تدبیر والا ہے اور اس کے سارے کام حکمت والے ہیں۔"

مذکورہ آیات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہودی قتل عیسیٰؑ کے دعویدار ہیں اور وہ اس پر فخر بھی کرتے رہے ہیں۔ دوسری طرف یہ واقعہ ہی سرے سے اشتباہ پر مبنی ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ کو دشمنوں کے چنگل سے نجات عطا کی اور انھیں آسمان پر اٹھالیا ہے۔

اسلامی مآخذ میں یہ مشہور ہے کہ "یہودا" جو حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں میں سے ایک تھا، حضرت سے خیانت کرکے ان دشمنوں سے جا ملا، جو آپ کی سخت تلاش میں تھے اور اسی نے عیسیٰ کے ٹھکانے تک ان لوگوں کی رہنمائی کی لیکن اس سے پہلے کہ آپ کے دشمن وہاں پہنچ کر آپ کو گرفتار کریں حضرت عیسیٰ خداوند عالم کی مشیت سے آسمان کی جانب صعود کر گئے۔ جب دشمن وہاں پہنچے تو چونکہ وہ حضرت عیسیٰ کو بخوبی نہیں پہچانتے تھے لہٰذا وہاں موجود یہودا کو ہی عیسیٰ سمجھ کر گرفتار کرلیا اس نے لاکھ کہا کہ میں عیسیٰ نہیں ہوں لیکن کچھ حاصل نہ ہوا اور اسے دار پر چڑھا دیا گیا۔ اس طرح یہ تصور کرلیا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی دیدی گئی۔

البتہ عیسائیوں کی روایات میں بھی یہ بات ملتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ تین روز بعد قبر سے زندہ برآمد ہوئے اور آسمان کی جانب صعود کر گئے۔

یہ تھا ان باتوں کا خلاصہ جو ہمیں عیسیٰؑ اور عیسائیت کے بارے میں قرآن سے معلوم ہوتی ہیں۔

سزائیں اور تجسّم اعمال

جناب شیخ حسین نوری
ترجمہ: جناب سید علی الحسن رضوی

جیسا کہ ہم گزشتہ مقالہ میں عرض کر چکے ہیں، معاد سے متعلق مباحث کے ذیل میں جب یہ بات مسلّم و ثابت ہے کہ قیامت کے دن انسانی اعمال کا جائزہ لیا جاتا ہے اچھے اعمال الٰہی جزا اور برے اعمال برے نتائج و سزا سے روبرو ہوتے ہیں، بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ کیا قیامت میں اعمال کا بدلہ خود ان اعمال کے مجسم ہونے کی صورت میں ملتا ہے؟ اور یہ خود انسانی اعمال ہیں جو اس دنیا میں نیک و بد چہروں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اور ہر انسان کو بعینہٖ خود اس کے اعمال واپس کر دیئے جاتے ہیں اچھے اعمال "بہشت" اور اس کی نعمتوں کی صورت میں اور برے اعمال "جہنم" اور اس کے عذاب کی شکل میں، یا یہ کہ خود اعمال، اعمال کی جزا نہیں ہیں بلکہ اعمال کی جزا ان کے آثار ہیں جو ان ہی کے پیدا کردہ اور ان ہی کے مرتب کردہ ہوتے ہیں؟

علماء کے ایک گروہ نے پہلی بات اور ایک گروہ نے دوسری بات کہی ہے، وہ گروہ جو بڑی ہی صراحت کے ساتھ پہلی بات کہتا ہے ان میں شیخ بہائی نے کتاب اربعین میں، علامہ طباطبائیؒ نے تفسیر "المیزان" میں اور شہید مطہریؒ نے کتاب "عدل الٰہی" میں اسی رخ پر زور دیا ہے، جن کا اقتباس ہم گزشتہ مقالہ میں پیش کر چکے ہیں، یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ فقیہ و فلسفی شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء نے بھی اپنی کتاب "الفردوس الاعلیٰ" میں اسی راہ کو اپنایا ہے، یہ عالم بزرگ "معاد جسمانی" کی بحث میں یہ کہنے کے بعد کہ: "بعینہٖ یہی بدن میدان محشر میں واپس ہوتا ہے" مزید فرماتے ہیں کہ: "نہ صرف

یہ قابل محسوس صورتیں (انسانی بدن) واپس پلٹتی ہیں، بلکہ تمہارے ہر اچھے اور برے عمل میں مضمر حقیقتیں، صفات و ملکات اور اعمال کے جوہر وہاں پلٹ کر ظاہر و مجسم ہوتے ہیں، چغلخوری اور نمامی بچھو ہے جو تم کو ڈنک مارتا ہے، بڑوں کے سامنے ان کے چھوٹوں یا ماتحتوں کی برائی اور عیب چینی زہریلا سانپ ہے جو تم کو ڈس لیتا ہے، غیبت کرنا، مردہ کا گوشت ہے جو تم کھاتے ہو اسی طرح ہر وہ جرم و گناہ جو تمہارے اعضائے بدن۔ ہاتھ، پاؤں اور زبان۔ نے انجام دیا ہے، اپنی مناسب شکلوں کے ساتھ تمہاری طرف پلٹ آتا ہے اسی طرح ہر وہ اچھا کام جو تم نے انجام دیا ہے حسین و زیبا شکلوں میں تمہاری طرف پلٹ آتا ہے اور تم ان سے انس محسوس کرتے ہو، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: ووجدوا ما عملوا حاضرا ولا یظلم ربک احدا[1] یعنی: جو کچھ انہوں نے کیا تھا اپنے سامنے حاضر پایا، اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ نیز فرماتا ہے: وما ظلمنا ھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون[2] یعنی ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا انھوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: انما تجزون ما کنتم تعلمون[3] یعنی تم نے جو کچھ انجام دیا ہے جزا کے طور پر تمہارے سامنے ہے، اور اس کے بعد شیخ اضافہ فرماتے ہیں:۔

"جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے کہ اس آیۂ کریمہ کے اندر کوئی شئے محذوف و مقدر ہے جس کے تحت انھوں نے یہ معنی مراد لئے ہیں کہ: تم نے جو کچھ انجام دیا ہے اس کے بدلے میں تمہیں جزا دی جاتی ہے" صحیح نہیں ہے کلام میں کسی طرح کی حذف و تقدیر نہیں پائی جاتی اور مقصود یہ ہے کہ تم کو بعینہ خود تمہارے عمل کے ذریعہ سزا ملتی ہے اور تمہاری سزا خود تمہارے اعمال ہیں۔

اور حدیث میں ہے کہ روز قیامت خداوند عالم اپنے بندوں سے فرماتا ہے:۔

"اعمالکم ردت الیکم" یعنی تمہارے اعمال بعینہ تم کو واپس کر دیئے گئے ہیں، البتہ یہ اعمال اپنے جوہر و حقیقت کے ساتھ یعنی اپنی اصلی شکل میں واپس کئے گئے ہیں" بنابرایں جو کچھ بھی دنیا میں ہے مجاز ہے۔ حقیقت اس دوسری دنیا میں ظاہر و مجسم ہوتی ہے، بہرحال کہنے کا مطلب

---

[1] کہف / ۴۹ — [2] نحل / ۱۱۸

[3] طور / ۱۶

یہ ہے کہ: قیامت میں انسانوں کے اعمال مجسم ہوتے ہیں"۔ یہاں تک کہ آخر کلام میں آپ فرماتے ہیں: "شیخ بہاء الدین نے اپنی کتاب "اربعین" میں بعض اہل معرفت سے نقل کیا ہے کہ (حسد، تکبر، بخل اور غرور کے مانند) مذموم صفات (و اعمال) قیامت کے دن سانپوں کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں" جبکہ اس سے زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ ہم کہیں: مذموم صفات (بری عادتیں) اس وجود میں عیناً سانپ ہیں، یہ کہ سانپ کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں کیونکہ دنیا آخرت کا غلاف ہے یعنی دنیا کھال اور چھلکے کے مانند ہے اور آخرت مغز و حقیقت ہے اور آخرت اس وقت بھی دنیا کے باطن میں موجود ہے (البتہ ہم جب تک دنیا میں ہیں اس کو درک نہیں کرتے)

جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: یعلمون ظاهراً من الحیوٰة الدنیا وهم عن الآخرة هم غافلون" (روم / ۷)

یعنی: زیادہ تر لوگ دنیوی زندگی کی ظاہری صورت سے واقف ہیں اور آخرت سے غافل ہوتے ہیں۔ یستعجلونك بالعذاب وان جهنم لمحیطة بالکافرین (عنکبوت/۵۴)

یعنی: کفار تم سے آخرت کے عذاب میں جلدی کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ جہنم اس وقت بھی کفار کو گھیرے ہوئے ہے اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ آج بھی عذاب جہنم ان کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے (کیونکہ ان کے اعمال ہی بعینہ ان کے جہنم ہیں۔" [1]

نیز آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ منجملہ ان مقامات کے جہاں یہ بحث چھیڑی گئی ہے زبور آل محمدؐ یعنی صحیفۂ سجادیہ پر سید علی خاں کی شرح بھی ہے جو "ریاض السالکین" کے نام سے موسوم ہے۔ آپ نے ۱۳ سال کے عرصہ میں اپنی ۵۴ تقریروں کے درمیان صحیفۂ سجادیہ کی تمام ۵۴ دعاؤں کی بڑی ہی دقت کے ساتھ عالمانہ شرح کی ہے، اپنی اس شرح میں صحیفہ کی ۴۱ ویں دعا کے ذیل میں جس کا عنوان یہ ہے:-

"ومن دعائه (ع) فی طلب الستر والوقایة

یعنی اعمال کی پردہ پوشی چاہتے ہوئے حضرت (امام زین العابدین علیہ السلام) کی دعا۔

دعا کے الفاظ یہ ہیں:-

اللّٰھم صلّ علی محمّد وآله وافرشنی مهاد کرامتك و

---

[1] الفردوس الاعلیٰ، ص ۱۷۳ - ۱۷۷۔

اور دنی مشارع رحمتك واحللنی بحبوحة جنتك ولا تسمنی بالرّدّ عنك ولاتحرمنی بالخیبة منك ولاتقاصنی بما اجترحت ولاتناقشنی بما اکتسبت ولاتبرز مکتومی ولاتکشف مستوری ولاتحمل علیٰ میزان الانصاف عملی ولا تعلن علیٰ عیون الملاء خبری اخف عنهم ما یکون نشره علیّ عاراً واطو عنهم مایلحقنی عندك شناراً شرف درجتی برضوانك واکمل کرامتی بغفرانك وانظمنی فی اصحاب الیمین ووجهنی فی مسالك الآمنین واجعلنی فی فوج الفائزین واعمربی مجالس الصالحین آمین ربّ العالمین"

یعنی بارالٰہا محمدؐ آل محمدؐ پر رحمت نازل فرما اور میرے لئے اعزاز واکرام کے بستر بچھادے اور اپنی رحمتوں کے آب زلال سے مجھے سیراب فرما، مجھکو آغوشِ بہشت میں جگہ عطا کر اور اپنی بارگاہ مرحمت سے دور نہ کر اور ناامیدی کے ساتھ اپنی بارگاہ سے محروم نہ فرما، تیری بارگاہ میں اگر مجھ سے کچھ گناہ سرزد ہوئے ہیں تو ان کا مواخذہ نہ کر، میرے کردار ورفتار پر نکتہ نہ نکال، میرے راز کو ظاہر نہ کر اور میرے رموز کو فاش نہ فرما، میرے عمل کو عدالت کی ترازو پر نہ تول۔ اور میرے اسرار کو دوسروں کی نظروں میں برملا نہ کر اور جس چیز کا دوسروں کے درمیان پھیلنا میرے لئے شکست کا سبب ہوا سے مخفی قرار دے اور وہ طومار جو نامۂ اعمال کی سیاہی وبربادی کی حکایت کے سوا کچھ نہیں ہے لپیٹ دے، مجھکو بلند وبالا مقام ملکوت میں جو تیری رضا اور رضوان کی منزل ہے جگہ عنایت فرما، اور اپنی اس عنایت سے میرے شرف میں اضافہ فرما اور میری انسانی کرامت کو اپنی بخشش ونوازش کے ذریعہ کامل بنا مجھے سلسلۂ اصحاب یمین میں قرار دے اور مجھ کو امان یافتہ افراد کے زمرہ میں شمار فرما، مجھے گروہ فائزین میں قرار دے اور مجھ کو شائستہ وصالحین کی بزم میں

رونق کا وسیلہ بنا دے آمین رب العالمین "۔

اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے کہ: "لا تحمل علی میزان الا نصاف عملی" "میرے عمل کو عدالت کی ترازو پر نہ تول" فرماتے ہیں :۔

"قرآن کریم کی آیتوں اور اہل بیت علیہم السلام کی روایتوں میں قیامت کے دن "وزن اعمال" اور میزان اعمال کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے :۔

"والوزن یومئذٍ الحق فمن ثقلت موازینہ فاولئک هم المفلحون ومن خفت موازینہ فاولئک الذین خسروا انفسهم بما کانوا بآیاتنا یظلمون" (اعراف/۸-۹)

"یعنی آج اعمال کا تولا جانا حق ہے پس جن کے (اعمال کے) پلے بھاری ہوں گے یقیناً فائز المرام ہوں گے اور جن کے (نیک اعمال کے) پلے ہلکے ہوں وہی لوگ ہیں جنھوں نے ہماری آیات پر ظلم و نافرمانی کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔

نیز خدا فرماتا ہے :۔

ونضع الموازین القسط لیوم القیمۃ فلا تظلم نفس شیئاً وان کان مثقال حبۃٍ من خردلٍ اتینا بها وکفیٰ بنا حاسبین (انبیاء/۴۷)

"ہم قیامت کے دن کے لئے عدل کی ترازوئیں نصب کرتے ہیں اور کسی ایک شخص پر بھی ظلم نہ ہوگا اور اگر رائی کے برابر بھی کسی کا عمل ہوگا اس کا حساب ضرور کیا جائے گا اور ہم حساب کرنے کے لئے کافی ہیں"۔

اور حضرت پیغمبر اسلامؐ ماہ رمضان کی آمد کی مناسبت سے اپنے خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

"جو شخص مجھ پر زیادہ درود بھیجتا ہے خداوند عالم روز قیامت اس کی ترازو (کے اعمال خیر) کو زیادہ وزنی کر دے گا"۔ نیز آنحضرتؐ فرماتے ہیں: "بندہ کو روز قیامت خداوند عالم کے سامنے حاضر کرتے ہیں اور اس کے حسنات و اعمال خیر کو ایک پلہ پر اور گناہوں کو دوسرے

پلہ پر رکھتے ہیں۔ ۔۔۔" یہی وہ منزل ہے جہاں علمائے اسلام قرآن مجید اور دینی احادیث میں مذکور "وزن و میزان" کی کیفیت کے بارے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں کہ آیا یہ تعبیرات الٰہی عدل و انصاف کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ روز قیامت انسانی اعمال کے سلسلہ میں عدل و انصاف سے کام لیا جائے گا اور ان تعبیرات کا مطلب یہ ہے کہ انسانی اعمال کا جائزہ لینے کے بعد جزا یا سزا کا دیا جانا عدل الٰہی کی بنیاد پر ہوگا یا یہ کہ اس سے مراد واقعی طور پر اعمال کا تولا جانا ہے یعنی کیا عملی طور پر اچھے اور برے اعمال ترازو کے دو پلّوں پر تولے جائیں گے؟

عالم اسلام کے بزرگ عالم دین شیخ مفید رضوان اللہ علیہ فرماتے ہیں: قیامت کے دن اعمال کے وزن کرنے سے مراد یہ ہے کہ اعمال اور اس کی جزا و سزا کے درمیان توازن کارفرما ہے یعنی حساب کتاب عدالت کی بنیاد پر لیا جائے گا اور اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ وہاں دو پلے والی ترازو نصب ہو اور اس میں اعمال تولے جائیں کیونکہ اس قسم کی باتیں جسم و جسمانیات سے مخصوص ہیں اور انسانی اعمال کا شمار اعراض[1] میں ہوتا ہے اور عرض کو تولا اور ناپا نہیں جا سکتا۔

اسی طرح بھاری ہونا اور ہلکا ہونا ثواب و طاعت میں کمی و زیادتی کی طرف اشارہ ہے اور ہمیں اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ قرآن عربی زبان و لغت کے اعتبار سے نازل ہوا ہے اور عربی کلمات میں کنایہ و مجاز کثرت سے موجود ہے۔

لیکن ایک دوسرے بزرگ عالم دین شیخ بہائی نے فرمایا ہے کہ اس طرح کے تعبیرات (وزن، میزان، بھاری ہونا ہلکا ہونا) کو ہم ان کے اصل معنی پر حمل کرتے ہیں، اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسانی نامۂ اعمال کو تولتے اور وزن کرتے ہیں، بلکہ چونکہ روز قیامت خود اعمال مجسم ہو کر سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا بھاری ہونا یا ہلکا ہونا، جو اجسام کے خصوصیات میں سے ہے ان کے لئے بھی صادق آتا ہے۔

بنابرایں خود اعمال تولے اور وزن کئے جاتے ہیں اور یہ جو کہتے ہیں کہ اعمال عرض ہیں

---

[1] عرض فلسفہ کی اصطلاح میں ایسے وجود کو کہتے ہیں جو بالذات قائم نہیں ہوتا اس کے برخلاف جوہر وہ موجود ہے جو قائم بالذات ہوتا ہے۔

اور عرض کو تولا اور وزن کیا نہیں جا سکتا، صحیح نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے ایک چیز دنیا میں عرض ہو اور عالم آخرت میں جوہر ہو۔ ایک نئی دنیا اور نئے وجود کے ساتھ اشیاء کے ظہور اور خصوصیات میں بھی تبدیلی عین ممکن ہے ناقابل قبول نہیں ہے۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ ایک چیز عالم بیداری میں ایک مخصوص خاصیت کی حامل ہوتی ہے اور وہی چیز عالم خواب میں دوسری خاصیت پیدا کر لیتی ہے؟[1]

یہ بھی عالم بزرگ سید علی خان کی عبارت جو انھوں نے صحیفۂ سجادیہ کی شرح میں تحریر فرمائی ہے۔ صاحب "بحار الانوار" علامہ مجلسی نے اس نظریے کی مخالفت کی ہے وہ بہشت و جہنم، ثواب و عذاب اور بالآخر جزا و سزا کو انسانی اعمال سے جدا قرار دیتے ہوئے ان چیزوں کو اعمال کی بنیاد پر مرتب ہونے والے آثار و نتائج کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ شیخ بہاؤ الدین عاملی کی مذکورہ عبارت نقل کرنے کے بعد جس میں انھوں نے شدت کے ساتھ پہلے نظریہ کی طرفداری کی ہے، علامہ مجلسی کہتے ہیں: "شیخ بہائی کا نظریہ قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس نظریے کے تحت عرض (انسانی اعمال) کا جوہر[2] میں تبدیل ہونا لازم آتا ہے اور عرض کا جوہر میں تبدیل ہونا یا بالعکس جوہر کا عرض میں تبدیل ہونا محال ہے۔

اور اس سلسلہ میں دنیا و آخرت کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا اور یہ کہ دنیا میں تو عرض کا جوہر میں تبدیل ہونا محال ہو اور عالم آخرت میں یہ تبدیلی ممکن ہو قابل قبول نہیں ہے یہ ایک طرح کے سفسطہ اور مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے، کیونکہ آخرت میں ملنے والا وجود دنیوی وجود کے ہی مانند ہے ان کے درمیان محض اتنا فرق ہے ایک موت سے قبل ہے اور ایک موت کے بعد ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں وجودوں کے درمیان موت کا واقع ہونا ایک امر محال کو ممکن نہیں بنا سکتا۔ اس کے بعد علامہ مجلسی لکھتے ہیں: آیات و روایات جو بظاہر اعمال کے مجسم ہونے پر دلالت کرتے ہیں قابل توجیہ ہیں اور ناگزیر طور پر مورد توجیہ قرار پاتے ہیں۔[3]

---

[1] ریاض السالکین ۔ سید علی خان ص ۳۹۹

[2] علامہ مجلسی علیہ الرحمہ کا مقصود یہ ہے کہ انسانی اعمال، جن کا مقولۂ عرض سے تعلق ہے (فلسفیوں نے تمام موجودات کو دس مقولات میں تقسیم کیا ہے ان میں سے ایک مقولہ عرض ہے) اگر روز قیامت مجسم ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے یہ عرض سے جوہر میں تبدیل ہوں اور یہ ایک امر محال ہے۔

[3] بحار الانوار جلد ۷، ص ۲۳۰

اس سلسلہ میں علامہ مجلسی کی گفتگو سے متعلق یہ بات کہنا ضروری ہے کہ اس دنیا اور عالم آخرت کے درمیان فرق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ "ایک موت سے قبل اور ایک موت کے بعد ہے" بلکہ ان کے درمیان اس سے کہیں زیادہ وسیع و عمیق فرق ہے۔ چنانچہ جیسا کہ قرآنی آیات و روایات سے پتہ چلتا ہے کہ عالم آخرت میں بنیادی طور پر موجودات ایک دوسرے ہی چہرے اور خد و خال میں دوبارہ ظاہر ہوں گے آخرت کی دنیا وہ دنیا ہے جہاں ہر چیز زندہ ہے، یہ وہ دنیا ہے جہاں زمین و زبان گفتگو کرتے ہیں، اور انسانی بدن کے اعضاء و جوارح اس کے اعمال کی گواہی دیتے ہیں، مغرور و متکبر افراد چیونٹی، چغل خور بندر اور حرام خور سوّر کی شکل میں محشور ہوتے ہیں[1] اور وہ نارِ بائے جو ظالموں اور ستمگروں کے ہاتھوں میں رہے ہیں، سانپوں کی صورت میں محشور ہوتے ہیں، مختصر یہ کہ عالم آخرت وہ دنیا ہے جہاں حقائق ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور تمام چیزیں اپنی اصلی و باطنی شکل میں آشکار ہو جاتی ہے۔

عالم افسردہ است نام او جماد ؛ جامد افسردہ بود ای اوستاد
باش تا خورشید حشر آید عیان ؛ تا ببینی جنبش جسم جہان
مردہ اینسو ینددو آنسو زندہ اند ؛ خامش اینجا و آنطرف گویندہ اند

اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ عرض کے جوہر میں تبدیل ہونے کی بحث اساسی طور پر قیامت کے دن اعمال کے مجسم ہونے سے مربوط نہیں ہے۔ عالم آخرت میں نہ صرف انسانوں کے اعمال ایک دوسری شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے بلکہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو دنیا میں ایک مخصوص چہرہ رکھتی ہیں اور اس دنیا میں دوسرے چہرے اور شکل میں ظاہر ہوں گی اور یہ بات اہل بیت عصمت و طہارت علیہم السلام کی احادیث کو دیکھنے سے روشن ہو جاتی ہے، ہم نمونے کے طور پر ان میں سے کچھ چیزیں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ قرآن مجید

جیسا کہ معلوم ہے قرآن مجید اس دنیا میں ایک ایسی مقدس کتاب کی صورت میں،

---

[1] بحار الانوار جلد ۷، ص ۲۱۶

جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور اس میں انسانوں کے لئے ایک مہذب و مدوّن زندگی بسر کرنے کے اصول و قوانین پیش کئے گئے ہیں لیکن اسلامی احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ آخرت میں یہی کتاب ایک دوسری صورت اور شکل میں ظاہر ہوگی۔"

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سعد خفاف نامی ایک شخص سے فرماتے ہیں:۔

"اے سعد! قرآن کو یاد کرلو کیونکہ قرآن روز قیامت بہترین شکل و صورت میں ظاہر ہوگا اور اس وقت جبکہ میدان حشر میں لوگ ایک لاکھ ۲۰ ہزار صفوں میں کھڑے ہوں گے جن میں ۸۰ ہزار صفیں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتیوں کی ہوں گی اور ۴۰ ہزار صفیں دیگر پیغمبروں کی امتوں کی ہوں گی۔ (قرآن مجید) پہلے تو مسلمانوں کی صفوں کی طرف رخ کر کے انھیں سلام کرے گا اور وہ لوگ اس کا حسن و جمال اور عظمت و شوکت دیکھ کر حیرت زدہ ہوں گے اور کہیں گے" لا الٰہ الا اللہ الحلیم الکریم " یہ شخص جو اس قدر جمال و نورانیت اور عظمت کا حامل ہے کون ہے؟

اس کے بعد وہ شہدائے راہ خدا کی طرف جائے گا وہ بھی اس کا حسن و جمال اور شکوہ و جلال دیکھ کر خیرہ ہوجائیں گے اور کہیں گے" لا الٰہ الا اللہ الرب الرحیم " یہ شخص اس قدر شکوہ و عظمت اور روشنی و زیبائی کا حامل ہے گویا شہدائے دریا سے ہو یہی وجہ ہے کہ اس کو اس قدر عظمت و اہمیت اور جمال و شکوہ دیا گیا ہے!! (غالباً خشکی اور دریا میں شہید ہونے والے شہدائے راہ خدا کے درمیان فرق واضح کرنا مقصود ہے)

وہاں سے وہ شہیدان دریا کی طرف بڑھے گا وہ بھی جس وقت اس کو دیکھیں گے اس کی عظمت و جلالت کو دیکھ کر متعجب ہوں گے اور کہیں گے" اس شکوہ و عظمت کا حامل یہ شخص شہیدان دریا سے ہے مگر شاید وہ جزیرہ اور وہ نقطہ جہاں اس کو شہادت نصیب ہوئی ہے اس جزیرے اور نقطے سے جہاں ہم شہید ہوئے ہیں زیادہ بلند و پرخطر مقام ہو۔

پھر وہ وہاں سے بھی گزر کر پیغمبران خدا کی شکل میں انبیا علیہم السلام کی صف کی طرف اس شان سے آئے گا کہ پیغمبران خداؑ اس کے شکوہ و عظمت کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے

اور کہیں گے : "لا الٰہ الا اللہ الحلیم الکریم" یہ بھی گویا کوئی پیغمبر ہے لیکن بہت زیادہ عظمتوں کا حامل ہے ۔ اس کے بعد وہ سب کے سب جمع ہو کر حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے : اے محمدؐ ! یہ شخص کون ہے ؟

پیغمبر اسلامؐ ان سے فرمائیں گے : کیا تم لوگ اس کو نہیں پہچانتے ؟

وہ کہیں گے ، نہیں ہم اس کو نہیں پہچانتے مگر اتنا جانتے ہیں کہ یہ رحمت الٰہی سے مالا مال ہے ۔

حضرت پیغمبر اسلامؐ فرمائیں گے : یہ لوگوں پر خدا کی حجت ہے ۔ اس کے بعد وہ وہاں سے بھی آگے بڑھ کر فرشتوں کی طرف خدا کے ایک مقرب فرشتہ کی شکل میں آئے گا جب فرشتے اس کو اس عظمت و جمال کے ساتھ دیکھیں گے تعجب کریں گے اور کہیں گے : ہمارا پروردگار بزرگ و مقدس ہے !! گویا لگتا ہے کہ یہ شخص فرشتوں میں سے ہے اور اسی لئے اس کو اس قدر عظمت و اہمیت اور شکوہ و جلالت حاصل ہے ۔

اس کے بعد وہ وہاں سے بھی آگے بڑھ کر زیر عرش الٰہی ٹھہرے گا اور سجدہ میں گر جائے گا اس وقت خداوند عالم اس کو آواز دے گا : "اے روئے زمین پر میری حجت ! اے میرے صادق و ناطق کلام ! "اپنا سر اٹھا اور جو کچھ چاہتا ہے مجھ سے طلب کر تجھکو دیا جائے گا اور شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی ۔

جب وہ سر کو بلند کرے گا ، خداوند عالم اس سے خطاب فرمائے گا :-

تو نے میرے بندوں کو اپنے سلسلہ میں کیسا پایا ؟

وہ جواب میں کہے گا : "پروردگارا ! ایک گروہ نے میرے حق کا پاس و لحاظ رکھا اور میری تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے میرے راستے پر قدم بڑھایا لیکن ان میں سے ایک گروہ نے میری پروا نہ کی اور میرے حق کو سبک خیال کرتے ہوئے میری تعلیمات پر توجہ اور عمل نہ کیا اور باوجود اس کے کہ میں تمام لوگوں کے لئے حجت و دلیل ہوں انھوں نے میری تکذیب کی ۔"

اس وقت خداوند تبارک و تعالیٰ فرمائے گا : "مجھکو میری عزت و جلال و عظمت کی قسم آج ان لوگوں کو بہترین جزا ملے گی جو تیرے اندر درج اصول و قوانین پر عمل پیرا رہے ہیں ۔ اور ان لوگوں کے لئے شدید ترین و دردناک ترین عذاب ہے جنھوں نے تیری رہنمائیوں

سے روگردانی کرتے ہوئے ان پر عمل نہیں کیا ہے۔"
اس کے بعد قرآن لوگوں کی طرف رخ کرے گا اور جن لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے ان کے قریب آکر کہے گا:۔

"میں وہی ہوں جس کے انس میں تم راتوں کو بیدار رہا کرتے تھے، اور میری تعلیمات کو عملی شکل عطا کرنے کے لئے تم زحمتیں اور اذیتیں برداشت کیا کرتے تھے، آج کا دن وہ دن ہے کہ ہر شخص کو اس کی کارکردگی اور زحمتوں کا نتیجہ دیا جائے گا۔ میں آج تمہارا پشت پناہ ہوں اس کے بعد اپنا چہرہ پروردگار عالم کی طرف پھیر کر کہے گا: پروردگارا! تیرے بندے نے جس کے حال سے تو بہتر طور پر واقف ہے میری تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں خود کو زحمت میں مبتلا کیا اور اس نے ہمیشہ میرے حق کا پاس ولحاظ رکھا ہے۔ میرے لئے اس نے دوست بنائے اور میرے ہی لئے اس نے دشمن بنائے ہیں۔
اس وقت خدا فرمائے گا: میرے اس بندے کو اب بہشت میں لے جا کر بہشتی لباس میں ملبوس کرو اور اس کے سر پر بہشت کا تاج رکھ دو۔"
پھر خدا فرمائے گا میں اپنی عزت وجلالت کی قسم کھاتا ہوں آج اس طرح کے افراد کو میں پانچ باتوں سے نوازتا ہوں:۔

۱۔ یہ ہمیشہ جوان رہیں گے، ہرگز پیری ان کے قریب نہیں آئے گی۔
۲۔ ہمیشہ صحت مند وتندرست رہیں گے کبھی ان پر بیماری عارض نہ ہوگی۔
۳۔ ہمیشہ غنی وتونگر رہیں گے، فقر وتنگدستی کبھی ان پر سایہ فگن نہ ہو گی۔
۴۔ ہمیشہ شاد وخرم رہیں گے، کبھی ان پر حزن واندوہ طاری نہ ہو گا۔
۵۔ ہمیشہ زندہ رہیں گے، موت کبھی ان کی تلاش میں نہ آئے گی۔

۲۔ ماہ رمضان المبارک

ہمیں معلوم ہے کہ "ماہ رمضان" سال کے ۱۲ مہینوں میں سے ایک مہینہ ہے، اور خصوصی عظمت وخصوصیت کا حامل ہے اسی مہینہ میں قرآن کریم نازل ہوا ہے اور اسلام کی ایک نہایت ہی

اہم عبادت "روزہ" اس ماہ میں واجب قرار دیا گیا ہے لیکن یہی ماہ رمضان روز قیامت ایک دوسری ہی شکل میں محشور ہوتا ہے۔

تفسیر حضرت امام حسن عسکریؑ میں وارد ہوا ہے کہ روز قیامت خداوند عالم "ماہ رمضان" کو ایک نہایت ہی حسین و خوبصورت شکل میں محشور کرے گا، اور اس کو ایک بلند مقام پر جگہ عطا کرے گا تاکہ تمام اہل محشر اس کو دیکھ سکیں، اور بہشتی لباسوں میں سے بہت سارے لباس اور طرح طرح کی پوشاکیں اور زیورات اس کے اختیار میں دے دیئے جائیں گے۔

اس کے بعد ایک منادی عرش الٰہی سے آواز دے گا کہ اے لوگو! آیا اس باعظمت چہرے والے کو پہچانتے ہو، یہ کون ہے؟

لوگ جواب میں کہیں گے: پروردگارا! ہم اس باعظمت چہرے کو نہیں پہچانتے۔

الٰہی منادی آواز دے گا: یہ ماہ رمضان ہے، کتنے ایسے لوگ ہیں جو اس کے طفیل اہل سعادت بن گئے اور کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو اس کے ذریعہ اہل شقاوت قرار پائے۔

اب یاد رکھو! ہر وہ مومن جس نے ماہ رمضان میں خدا کی عبادت کو عظیم سمجھا ہے اور اس ماہ میں اپنے فرائض ادا کئے ہیں، قریب آئے اور اپنی طاعت و عبادت کے مدارج کے اعتبار سے ان خلعتوں میں سے اپنا حق لے لے، اس کے بعد وہ مومن افراد جنھوں نے اس ماہ میں طاعت خدا کی راہ میں قدم بڑھایا ہے، اور اپنے فرائض پر عمل کیا ہے آگے بڑھیں گے اور ان خلعتوں میں سے اپنی اطاعت اور عمل کی سنجیدگی کے اعتبار سے لباس لے کر زیب تن کریں گے۔

لیکن وہ افراد جو ماہ رمضان کے احترام اور اس کی اہمیت کے قائل نہ تھے، اور جنھوں نے اس ماہ میں اپنے فرائض پر عمل نہیں کیا۔ انھیں آتشیں لباس پہنا دیئے جائیں گے۔[1]

اس طرح کے نمونوں سے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ روز قیامت حقائق کے آشکار ہونے اور موجودات عالم کے باطنی و حقیقی چہروں کے نمایاں ہونے کا دن ہے، بنابریں! اعمال کا مجسم ہونا اور اعمال کے ذریعہ ہی اعمال کا بدلہ ملنا، چونکہ ایک قرآنی و حدیثی حقیقت ہے، لہذا ایسا ہونا بعید نظر نہیں آتا۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۷، ص ۱۹۰

خدا کی فطری معرفت

جناب استاد محمد تقی مصباح یزدی
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

آیۂ میثاق

سورۂ اعراف میں خدا ارشاد فرماتا ہے:-

"واذ اخذ ربک من بنی آدم من ظهورهم ذریتهم واشهدهم علی انفسهم الست بربکم قالوا بلیٰ شهدنا ان تقولوا یوم القیامة انا کنا عن هذا غافلین. او تقولوا انما اشرک اٰباؤنا من قبل وکنا ذریة من بعدهم افتهلکنا بما فعل المبطلون" (آیت/۱۷۲،۱۷۳)

"اور (اے رسولؐ یاد دلاؤ) وہ وقت جب تمہارے پروردگار نے اولاد آدمؑ کی پشت سے ان کی اولاد کو باہر نکال کر خود ان ہی کو ان پر شاہد و گواہ قرار دیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تو سب نے اقرار کیا کیوں نہیں، ہم گواہ ہیں (اور خدا نے یہ کام انجام دیا) تاکہ روزِ قیامت تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہم اس بات سے غافل تھے، یا یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے سے ہی شرک اختیار کر رکھا تھا اور ہم ان کی اولاد تھے (اور ان ہی کے نقش قدم پر چل رہے تھے) تو کیا تو ہم کو ان

باطل پرستوں کے غلط کام کی سزا میں تباہ کر دے گا ؟"

یہ آیتیں تفسیر کے اعتبار سے قرآن کریم کی مشکل آیتوں میں سے ہیں، اور مختلف پہلوؤں سے تفصیلی بحث کی طالب ہیں لیکن اگر ہم ان تمام بحثوں کو یہاں چھیڑتے ہیں تو جو مقصد ہے ہم اس سے دور ہو جائیں گے مفسرین ان آیات کے ایک ایک جملہ کی توضیح اور ان کے درمیان باہمی ربط پیدا کرنے نیز ان کا اصل نچوڑ پیش کرنے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں کے ایک ایک جملوں کے سلسلہ میں بہت سارے سوالات ہیں یہاں تک کہ بعض نے کہہ دیا ہے کہ ہم ان آیتوں سے کچھ بھی سمجھ نہیں پاتے۔ یہ متشابہ آیتوں میں سے ہے اور اس کے علم کو اس کے اہل افراد کے لئے چھوڑ دینا چاہئے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اگرچہ ان آیات کے دقیق نکتوں میں ابہامات پائے جاتے ہیں اور ان کا متشابہات سے ہونا بھی صحیح ہے پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ متشابہ آیات سے کسی طرح کا استفادہ نہیں کیا جا سکتا، اور کسی بھی عنوان سے ان سے شبہات کا دور کیا جانا ممکن نہیں ہے؟ دونوں آیتوں پر غور کرنے سے ایک بات تو پوری طرح روشن و واضح ہے، اگر مسئلہ ہے بھی تو یہ کہ اس بات کو قبول کرنے کی صورت کیا ہو؟ یعنی مسئلہ دراصل ہماری کوتاہی فہم کا ہے نہ یہ کہ آیت سے کوئی بات پتہ نہیں چلتی۔ آیت واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ خدا نے انسانوں کی ایک ایک فرد کو اپنے آمنے سامنے حاضر کر کے ان سے یہ سوال کیا ہے: کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں؟ اور انھوں نے جواب دیا، کیوں نہیں تو ہی ہمارا خدا ہے اور یہ ایک ایک انسان سے خدا کا روبرو سوال کرنا اس لئے ہے کہ مشرکین کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم سرے سے اس توحید اور یکتا پرستی کی طرف سے غافل تھے یا یہ کہہ سکیں کہ ہم اپنے باپ دادا کی پیروی کی وجہ سے مشرک ہو گئے تھے۔ اس کا گناہ ہمارے بزرگوں کے سر ہے، ہم ذمہ دار نہیں ہیں، یہ کہ قرآن کی آیات ہم کو اس مطلب تک پہنچانا چاہتی ہیں اس بات میں کوئی شک نہیں ہے، ابہام اس میں ہے کہ ہم اپنے اندر کسی ایسی شئ کا وجود نہیں پاتے جو بتائے کہ ہم کبھی خدا کے روبرو حاضر ہو چکے ہیں اور خدا نے ہم سے پوچھا ہو کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں؟

اور ہم نے جواب دیا ہو کہ کیوں نہیں، چونکہ اس طرح کی کوئی علامت ہم اپنے اندر نہیں پاتے اور نہ ہی اس کا کوئی سراغ ہم کو ملتا ہے اس لئے مشکل پیش آتی ہے کہ ان آیتوں سے اس بات کا کیسے استفادہ کریں؟ ورنہ

یہ کہ یہ آیتیں اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ البتہ یہاں چند سوالات کرے (ہمارا اور خدا کا آمنا سامنا) کس عالم میں ہوا؟ کن حالات میں ہوا؟ اجتماعی تھا یا انفرادی؟ پیش آتے ہیں لیکن آیت کے اس مطلب اور اس بیان میں کوئی ابہام نہیں پایا جاتا کیا یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ بلا استثنا ایک ایک فرد خدا سے روبرو ہوئی ہو اور اس کے اور خدا کے درمیان اس طرح کی گفتگو ہوئی ہو؟ اس مکالمہ اور خدا سے روبرو ہونے کے سلسلہ میں جو مفہوم بھی تصور کیا جائے بہر حال یہ طے ہے کہ یہ باتیں غائبانہ یا پس پردہ انجام نہیں پائی ہیں کہ کوئی کہیں سے آواز بلند کرے اور پوچھے آیا میں فلاں نہیں ہوں؟ اور آپ بھی جواب میں آواز دیں کیوں نہیں تو فلاں ذات ہے، یہ بات اہمیت نہیں رکھتی یہ کام اس انداز سے ہونا چاہیئے کہ قابل خطا نہ ہو، قابل اشتباہ نہ ہو، ورنہ آپ کے لئے عذر کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے مثلاً اگر شیطان آواز دے کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں؟ اور ایک شخص یہ خیال کرے کہ خدا کی آواز ہے اور جواب دے کہ کیوں نہیں، تو یہ چیز قابل خطا ہے یعنی اگر صرف آواز کانوں تک پہنچے تو اس کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ بولنے والی فلاں ذات ہے، گفتگو میں عذر اور تطبیق میں غلطی کی گنجائش اسی وقت باقی نہیں رہتی جب کہ آپ اپنے مقابل کو دیکھ اور پہچان رہے ہوں۔ پس مذکورہ آیات کا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان اس طور پر گفتگو ہوئی ہے کہ تطبیق میں غلطی کا کسی طرح عذر باقی نہیں چھوڑا گیا ہے، کوئی بھی ایسا عذر جو قیامت کے دن بندہ اپنے خدا کے سامنے پیش کر سکے کہ میں اس وجہ سے تجھ کو نہ پہچان سکا اور تیری عبادت نہیں کی۔ قابل قبول نہیں ہے، آیات کا مدعا اور تقاضا یہی ہے کہ انسان چاہے وہ کوئی بھی ہو، ایک بار خدا سے اس طرح روبرو ہوا ہے کہ اس کی بنیاد پر خدا کا بندے سے یہ کہنا درست ہو کہ کیا میں تیرا خدا نہیں ہوں؟ اور وہ بھی یہ کہے کہ ہاں ہاں، میں گواہی دیتا ہوں۔

اس آیۂ شریفہ سے جو بات واضح طور پر ہاتھ آتی ہے یہ ہے کہ ہر انسان کو ایک طرح کی معرفت خدائے یکتا کی حاصل ہے جس کے حصول کی کیفیت کو ہم اس صورت سے تعبیر کر سکتے ہیں کہ خدا نے ان سے کہا: "الست بربکم" اور انھوں نے جواب دیا "بلی شھدنا" اور یہ گفتگو اس طور پر ہوئی ہے کہ اس نے تطبیق کی منزل میں کسی طرح کی خطا اور عذر و بہانے کی گنجائش باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اور اس بنیاد پر، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں قیامت کے دن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم ربوبیت الٰہی سے آشنا نہیں تھے، یا اس ذیل میں اپنے بزرگوں اور باپ داداؤں کی پیروی کو شرک و کج روی

کا بہانہ نہیں بنا سکتا۔

چنانچہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح کی دو بدو حضوری گفتگو، اور مقام تطبیق میں غلطی اور عذر تراشی کے تمام امکانات کا سد باب علم حضوری اور شہود قلبی کے بغیر قابل تحصیل نہیں ہے اور اسی کی مؤید وہ کثیر روایات ہیں جو "رویت" اور مشاہدہ جیسی تعبیرات پر مشتمل نظر آتی ہیں۔

ایسی متعدد روایات ہیں جو سب کی سب نفس مضمون کے اعتبار سے متشابہ اور سند کے لحاظ سے معتبر ہیں اور "اصول کافی" "تفسیر علی ابن ابراھیم" "تفسیر برہان" "تفسیر نور الثقلین" نیز دوسری معتبر کتابوں میں نقل ہوئی ہیں چنانچہ کافی کی ایک روایت میں جو آیہ فطرت کے ذیل میں امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے حضرت فرماتے ہیں:-

فعرفهم واراهم نفسه ولولا ذلك لم يعرف احد ربه[1]

یعنی خدا نے ان کے سامنے اپنے آپ کو پہچنوایا اور ظاہر کیا اور اگر ایسا نہ ہوتا کوئی بھی اپنے پروردگار کو نہ پہچانتا۔

تفسیر علی ابن ابراھیم قمی میں "ابن مسکان" سے روایت ہے کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا:-

"معاينة كان هذا؟ قال نعم"[2]

"یعنی کیا آنکھوں سے عیناً خدا کا مشاہدہ کیا، حضرت نے فرمایا: ہاں"

محاسن برقی میں زرارہ امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا:-

ولولا ذلك لم يدر احد من خالقه ورازقه[3]

یعنی اگر یہ منظر سامنے نہ آتا کوئی نہ جانتا کہ کون اس کا خالق ہے اور کون اس کا رازق۔

ان عبارتوں سے استفادہ ہوتا ہے کہ وہ معرفت جس کی طرف آیہ شریفہ میں اشارہ کیا گیا ہے ایک قسم کی شخصی معرفت ہے کلی معرفت نہیں ہے جو مفاہیم انتزاعی (یعنی کل سے جزء کی معرفت) اور عقلی دلیلوں سے حاصل ہوتی ہے، اور خداوند متعال سے متعلق شخصی معرفت حضوری و شہودی

[1] کافی جلد ۲ ص ۱۳ [2] تفسیر المیزان ج ۸ ص ۳۴۰ [3] تفسیر المیزان جلد ۸ ص ۳۴۵

علم کی راہ کے علاوہ کسی اور طریقے سے ممکن نہیں ہے۔ اور اگر اس معرفت سے مراد کلی اور عقلی استدلالات کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی معرفت ہوتی تو حدیث کے الفاظ یوں ہونے چاہئے تھے کہ: "ولولا ذلک لم یعلم احد ان لہ خالقاً" یعنی کوئی شخص نہ جانتا کہ اس کا ایک خالق بھی ہے نہ یہ کہ "لم یدر احدٌ من خالقہ" کہ کون اس کا خالق ہے، ہم اس مطلب کی مزید وضاحت کرتے ہوئے قارئین کرام سے مزید دقت نظر کے طالب ہیں:۔

اگر انسان کو علم شہودی حاصل نہ ہو تو محض کلی حقیقتوں کو ہی درک کر سکتا ہے مثلاً یہ کہ کوئی ہے جس نے یہ مخصوص کام انجام دیا ہے اگر آپ نے کسی عمارت کے معمار کو نہ دیکھا ہو تو صرف اتنا سمجھ سکتے ہیں کہ کسی بنانے والے نے یہ چیز بنائی ہے اور مصنوع کے خصوصیات و صفات دیکھ کر صانع کے خصوصیات و صفات کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں جس قدر مہارت و صناعی میں دقت نظر سے کام لیا گیا ہو صانع کی مہارت و صلاحیت اور فن کاری پر روشنی پڑتی ہے، اس حد تک آپ کہہ سکتے ہیں کہ بنانے والا اپنے فن میں بڑا ہی ماہر اور نہایت ہی باسلیقہ معلوم ہوتا ہے، لیکن وہ کون ہے؟ ان استدلالات کے ذریعے اس کو نہیں پہچان سکتے، اس کی شخصیت آپ کے سامنے واضح ہو کر نہیں آسکتی، عقلی استدلالات ہمیں یہ بتا سکتے ہیں کہ دنیا کی تخلیق کرنے والا ایک حکیم اور صاحب قدرت و صلاحیت خالق ہے، لیکن یہ بات کلی مفاہیم کی حیثیت رکھتی ہے، کوئی ہے جو ایک عالم و حکیم اور صاحب قدرت و اختیار خالق ہے، لیکن یہ خالق کون ہے؟ یہ چیز ہمیں عقلی استدلالات نہیں بتاتے، اگر ہمارے اور خدا کے درمیان ایک درونی و قلبی رابطہ نہ ہوتا تو خود خدا کو ہم نہیں پہچان سکتے تھے، یہ تو ہم سمجھ لیتے کہ اس دنیا کا کوئی خالق ہے مگر کون ہے یہ نہیں جان سکتے تھے، ذات خالق کی شناخت اسی وقت ممکن ہے جب ہم کو اس سے ایک طرح کی شہودی نسبت حاصل ہو چکی ہو، ورنہ محض ایک کلی معرفت ہوگی۔

مذکورہ حدیث کے جملے پر غور کرنے کا مطالبہ ہم نے اسی لئے کیا تھا کہ "لولا ذلک لم یعلم (یا "لم یدر" یا "لم یعرف" جیسا کہ روایات میں مختلف لفظیں آئی ہیں) احدٌ انّ لہ خالقاً (یعنی اس کا کوئی خالق ہے) کہنے میں اور لم یعلم من خالقہ (یعنی کون اس کا خالق ہے) کہنے میں مفہوم کے لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ اور تمام روایات میں تعبیر یہی ملتی ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو کوئی نہ جانتا کہ اس کا خالق کون ہے یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اگر یہ گفتگو نہ ہوتی

تو کوئی نہ جانتا کہ دنیا ایک خالق بھی رکھتی ہے، کیونکہ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تب بھی انسانی عقل درک کرسکتی تھی کہ دنیا کا کوئی نہ کوئی خالق ہے۔ حتیٰ عقل اس کے صفات کو بھی سمجھ سکتی ہے۔ لیکن اس کی ذات کو سمجھ لے۔ یہ ممکن نہ ہوتا، چنانچہ یہ واقعہ (یوم الست) انسانی قلب اور خدا کے درمیان ایک طرح کا رابطہ برقرار ہونے کا سبب بنا ہے کہ انسان جب بھی دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھے "خود خدا" کو پالے نہ یہ کہ کوئی ایک پیدا کرنے والا ہے۔ اگر خدا توفیق دے اور بندہ پر وہ حالت طاری ہو کہ پوری توجہ کے ساتھ خدا سے دعا و مناجات کرے، اس کی توجہ ہر طرف سے منقطع ہو کر مکمل طور سے صرف خدا پر مرکوز ہو جائے تو اس پر وہ حالت پیدا ہوتی ہے کہ خود خدا کو دیکھتا ہے ایسا نہیں ہے کہ گویا پس پردہ سے گفتگو ہو رہی ہو کہ۔ لے وہ، جو آسمانوں اور زمین سے بالا ہے اور دنیا کو چلا رہا ہے، بلکہ وہ دعا و مناجات کرنے والے کے سامنے ہے گویا اس کی بات کو سن رہا ہے۔ امیرالمومنین سلام اللہ علیہ، نہج البلاغہ میں آیۂ شریفہ: رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللّٰہ[1] " (وہ اشخاص جن کو خدا کے ذکر اور نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے) نہ تجارت ہی غافل کرسکتی ہے نہ خرید و فروخت کا معاملہ) کے ذیل میں فرماتے ہیں:۔

"وان للذکر لاھلا[2]" ذکر دیا دخدا کے وہی اہل و مستحق ہیں جو دنیا کی لذتوں کے بدلے یاد خدا کا انتخاب کرتے ہیں۔ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے ذکر خدا کے اہل اور یاد خدا میں زندگی بسر کرنے والوں اور اسی کی یاد میں جینے والوں کے اوصاف ذکر فرمائے ہیں منجملہ ان کے فرماتے ہیں: "خدا ان کے باطن اور ان کے وجود میں ان سے راز و نیاز کرتا ہے۔" ذرا ان لفظوں پر غور فرمائیں، بجائے یہ کہنے کے کہ بندہ خدا سے مناجات کرتا ہے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں خدا بندے سے راز و نیاز کرتا ہے، ایسے لوگ ہیں جو پردہ میں خدا کے راز سنتے ہیں، ایک ایسی حالت انسان کے اندر پائی جاتی ہے، انسان اس عظمت کا مالک ہے اور ممکن ہے کہ وہ ایسے مقامات پر فائز ہو جائے۔ نہ صرف انبیاء اولیا اور معصومین صلوٰت اللہ علیہم اجمعین بلکہ وہ افراد بھی جو خدا کے بھیجے ہوئے اور معصوم پیشواؤں کے سچے پیرو ہیں ایسے مقامات پر پہنچ سکتے ہیں وہ آئے ہیں تاکہ دوسروں کے ہاتھ پکڑیں اور اپنی طرف کھینچ کر جس مقام تک خود پہنچ چکے ہیں ان کو بھی اس جگہ سے قریب کرلیں۔

---

[1] نور/ ۳۷ [2] نہج البلاغہ فیض الاسلام ص ۶۹۵، ص ۶۹۶

مختصر یہ کہ آیت یہ کہنا چاہتی ہے تمام انسانوں کے دل میں ذات خدا کی معرفت موجود ہے جب اس کے آثار مشاہدہ کرتا ہے وہ معرفت زندہ ہو جاتی ہے، یہ معرفت کسبی نہیں ہے بلکہ ایک فطری معرفت (اور فطری آشنائی) ہے۔ لیکن ہم اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں، جس وقت متوجہ ہو جاتے ہیں وہ معرفت عود کر کے تازہ و زندہ ہو جاتی ہے اور وہ روایت جو ہم نے نقل کی ہے اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگر ایک ایسا واقعہ رونما نہ ہوا ہوتا تو کوئی نہ جانتا کہ کون اس کا خالق ہے یعنی یہ تو جان سکتا تھا کہ اس کا کوئی خالق ہے لیکن یہ نہ جانتا کہ خالق کون ہے، کیونکہ اس کو کبھی دیکھا نہ تھا۔ اب چونکہ یہ شہودی معرفت حاصل ہو چکی ہے لہٰذا جب عقل رہنمائی کرتی ہے کہ دنیا کا کوئی خالق بھی ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ یہ خالق کون ہے، کیونکہ پہلے اس سے آشنائی حاصل ہو چکی ہے۔

پس اس نظریہ کے تحت (جس کی بہت سی روایتیں تائید بھی کرتی ہیں اور ایک ذاتی یا شخصی رائے نہیں ہے) ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن نے اس کی تصدیق کی ہے کہ انسان کے اندر خداوند متعال کی حضوری و شہودی معرفت موجود ہے۔ یہیں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسی شہود سے اصل ذات خدا کی معرفت حاصل ہونے کے علاوہ، دوسری بہت سی چیزیں بھی انسان کو حاصل ہوتی ہیں، منجملہ ان کے صفات خدا کی معرفت ہے: مثلاً خدا کی ربوبیت کی معرفت یعنی یہ شہود اس انداز کا تھا کہ آدمی صرف یہی نہیں سمجھتا کہ جو اس کا پیدا کرنے والا ہے وہ کون ہے بلکہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ وہی پالنے والا، صاحب اختیار و قدرت اور دنیا کا چلانے والا بھی ہے، اس آیت کے الفاظ اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ "الست بربکم" سے سوال کیا گیا ہے الست بخالقکم " نہیں ہے یعنی خدا انسانوں سے سوال کرتا ہے کیا میں تمہارا پروردگار اور تمہارا رب نہیں ہوں (پروردگار، رب کا بھرپور مفہوم ادا نہیں کرتا) وہی، جس کے اختیار میں تمہاری ہستی ہے گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ کیا تمہاری ہستی میرے اختیار و قدرت میں نہیں ہے؟ اور وہ جواب دیتے ہیں: کیوں نہیں، پس معلوم ہوا کہ نہ صرف خدا کی خالقیت بلکہ ربوبیت کا بھی اثبات ہوتا ہے، علاوہ برایں توحید بھی ثابت ہوتی ہے کہ: اس کے سوا دوسرا کوئی خالق و رب بھی نہیں ہے۔ اور یہ محض اس شہودی رابطہ یعنی حضوری معرفت کی وجہ سے ہے جو انسان اپنے خدا کی نسبت رکھتا ہے۔ یہ کوئی بکواس اور قاعدہ و حساب سے عاری چیز نہیں ہے۔ حضوری معرفت ایک قسم کی معرفت ہے جو انسان و خدا (اور فلسفیوں کی اصطلاح میں علت ہستی) کے درمیان موجود ہے

یعنی انسان ایک وجودی رابطہ کا مشاہدہ کرتا ہے۔ علم حضوری کا مطلب یہ ہے کہ وہ رابطہ جو میرے اور میرے خدا کے درمیان خلقت و تکوین کے اعتبار سے پایا جاتا ہے اس کا میں مشاہدہ کرتا ہوں، میرے یہاں اس طرح کا شہود کس ذات کے لئے ہے؟ ظاہر ہے ہر اس ذات سے جس کے ساتھ میرا یہ وجودی رابطہ ہو ایک تعلق و وابستگی پائی جاتی ہے جو مشاہدہ کی منزل میں آتی ہے اگر یہ وابستگی ہو تو دکھائی بھی دیتی ہے اور اگر وابستگی نہیں ہے تو کبھی یہ علم حضوری ایک معدوم شئے سے تعلق پیدا نہیں کرتا اور جس وقت وجود کے ساتھ وابستگی مشاہدہ میں آتی ہے تو جس سے بھی اس طرح کی وابستگی ہو مشاہدہ میں آتا ہے، انسانوں نے (وقت میثاق) مشاہدہ میں صرف اپنی وابستگی اللہ کے ساتھ مشاہدہ کی ہے اگر کسی دوسرے کے ساتھ بھی یہ وابستگی ہوتی تو اسے ضرور دیکھتے کیونکہ یہ شہود بلا کسی اصول و ضابطہ کے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ایک تکوینی رابطہ انسان اور خدا کے درمیان موجود ہے، مثلاً ایک بلب تار کے ذریعہ چھت سے لٹکایا اور وابستہ کیا گیا ہے، چھت اور بلب کے درمیان رابطہ وہی تار ہے جس کے ذریعہ بلب چھت سے لٹکا ہوا ہے، آنکھ رکھنے والا، اگر روشنی موجود ہو تو وہی سب کچھ دیکھتا ہے جو موجود ہے یعنی اگر صرف ایک تار چھت اور بلب کے درمیان وابستہ ہے تو ایک ہی تار کو دیکھتا ہے اور اگر دو ہوں تو دو اور اگر تین ہوں تو تین دیکھتا ہے۔

ہمارے اور خدا کے درمیان حقیقی و تکوینی رابطہ ہے یعنی ہمارا وجود اس سے وابستہ ہے، ذہن کو قریب کرنے کے لئے میں پھر مثال دیتا ہوں۔ یہ وابستگی بالکل ویسے ہی ہے جیسے ہمارے انسانی افعال اور ہمارے انسانی کیفیات ہم سے وابستہ ہیں، آپ کسی چیز کی صورت اپنے ذہن میں مجسم کریں تو کیا یہ ممکن ہے کہ یہی صورت بعینہٖ کسی اور کے ذہن میں بھی ہو؟ فرض کریں آپ نے ذہن میں سیب کا ایک درخت تصور کیا، تو اب یہ سیب کا درخت جو آپ کے ذہن میں ہے آپ کے ذہن کے بغیر قابل تصور نہیں ہے، کیونکہ بنیادی طور پر اس کی حقیقت آپ کے ذہن سے وابستہ ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ کی پوری کائنات کے ساتھ اسی طرح کی نسبت ہے بلکہ کچھ اس سے بھی بالاتر رابطہ ہے، یہ مثال تو ہم نے مطلب کو ذہن سے قریب کرنے کے لئے دی ہے، ورنہ انسان اور خدا کے درمیان یا اس پوری کائنات اور خدا کے درمیان رابطہ کی حقیقت کیا ہے ہم درک نہیں کر سکتے۔

معلوم ہوا اگر ایک تکوینی رابطہ خدا اور انسان، خدا اور کائنات کے مابین موجود ہو تو ہی

رابطہ مشاہدہ میں آتا ہے پس اگر انسان اور (العیاذ باللہ) دو خداؤں کے درمیان یہ رابطہ پایا جاتا یعنی ہمارے دو پیدا کرنے والے ہوتے تو منزل شہود میں اپنے وجودی رابطہ کا چند خداؤں کے ساتھ مشاہدہ ضروری ہوتا؟ اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ مورد بحث رابطہ میں چونکہ ہم نے ایک رب کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا ہے یہی دلیل اس بات کی ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور رب نہیں ہے، پس یہ مشاہدہ جس طرح خدا کے وجود کو ثابت کرتا ہے خدا کی ربوبیت کو بھی ثابت کرتا ہے منزل شہود میں آدمی نے دیکھا ہے اور دیکھتا ہے، البتہ اگر مکمل طور سے متوجہ ہو، کیونکہ خدا سے اس کی نسبت ایک صورت ذہنی جیسی ہے وہ ذہن جو اس کا تصور پیدا کرتا ہے دراصل اس کی پوری توجہ اس سے وابستہ ہوتی ہے، اگر آپ کا ذہن اس سیب کے درخت کی طرف متوجہ ہو، تو درخت کی صورت ذہنی وجود پیدا کرے گی اور اگر توجہ ادھر سے منصرف ہو چکی ہو تو سرے سے ذہن میں وہ صورت نہیں آتی بلکہ نابود ہو جاتی ہے۔ ؎

اگر نازی کند از ہم فرو ریزند قالب ہا

انسان کو اس کیفیت کا مشاہدہ کرنا چاہیے کہ اس کا وجودی طور پر اپنے خدا سے ایک ربط وارتباط ہے، اس کی ہستی دست قدرت الٰہی میں ہے چاہے تو ہے نہ چاہے تو نہیں ہے۔ اگر آدمی اس حالت کا مشاہدہ کرے تو گویا اس نے ربوبیت الٰہی کا مشاہدہ کر لیا ہے:۔

انما امرہ اذا اراد شیئًا ان یقول لہ کن فیکون (یٰسین/۸۲)

(جب وہ کسی شے کی تخلیق کا ارادہ کرتا ہے تو ادھر اس نے کہا کہ ہو جا، وہ ہو جاتی ہے)

گویا کہ: کہہ دے ہو جا تو ہے اور اگر کہہ دے نہ ہو (یا نہ کہے کہ اس کے بعد بھی موجود رہ) تو نہیں ہے۔

کائنات کا وجود خداوند تبارک و تعالیٰ کی نسبت اسی کیفیت و حالت کا حامل ہے، جب ہم اس حالت کو پالیں گے (یعنی وہی حالت جو ایک عالم میں، قرآن کے مطابق، ایک روز ہم کو نصیب ہو چکی ہے اور اس وقت اس کے محل وقوع کو ہم فراموش کر چکے ہیں، ایک بار پھر اگر اس کو سرحد کمال تک پہنچانے کی خدا توفیق دے دے، وہی معرفت جو اولیاء خدا کو حاصل ہے، ہمیں بھی حاصل ہو جائے اور وہ علم حضوری وجود پیدا کر لے)، تو ہم کو سمجھ میں آجائے گا کہ ہماری ہستی خدا کی نسبت

اس طرح کی ہے ہماری کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے دوسرے لفظوں میں ماسوی اللہ جو کچھ بھی ہے اسی کے ارادہ کا عکس اور جلوہ ہے، یہ کائنات منشاء الٰہی کے تحت ہے اگر اس کا ارادہ و منشاء نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا، اس بات کو انسان علم حضوری کے ذریعہ مشاہدہ کرسکتا ہے: وہ علم حضوری جو اس کو ایک عالم میں حاصل ہو چکا ہے، وہ عالم جس کا نام علماء نے "عالم ذر" یا عالم میثاق رکھا ہے، جہاں خداوند عالم نے "الست بربکم" کہہ کر بندوں سے میثاق عبودیت باندھا تھا، لیکن اس کی کیفیت کیا تھی وہ کون سا عالم تھا، ہمیں ان عوالم کی معرفت نہیں ہے، ہم تو صرف عالم طبیعت سے واقف ہیں ہم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ دنیا کس طرح کی دنیا تھی، کیسے یہ گفتگو ہوتی تھی، اور کس طرح یہ واقعہ رونما ہوا تھا۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کے سبب مختلف جہتوں سے ہمیں ان آیتوں میں ابہام نظر آتا ہے۔

اور اس کی علت بھی ہمارے فہم کا ناقص ہونا ہے جو ماوراء طبیعت سے آشنا نہیں ہے، پس اس مشاہدہ اور مکالمہ کی بنیاد پر ہمیں ذات اقدس الٰہی کی معرفت بھی حاصل ہو چکی ہے اور اس کی ربوبیت و وحدانیت سے بھی واقفیت پیدا کر چکے ہیں اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ یہ آتیں توحید فطری پر دلالت کرتی ہیں:۔

"فطرھم علی التوحید"[1] کی تعبیر سورہ روم کی آیۂ فطرت کے ذیل میں بھی آئی ہے اور اعراف کی آیۂ میثاق کے ذیل میں بھی وارد ہوئی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ خدا نے انسانوں کی فطرت و سرشت میں یکتا پرستی و دلیعت کی ہے۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ انسان ذات خدا کو بھی پہچانے، اس کی ربوبیت کو بھی سمجھے اور اس کی یکتائی اور قابل پرستش ہونے کو بھی درک کرے، اسی لئے ارشاد ہوتا ہے:۔

"فطرھم علی معرفتہ انہ ربھم"[2] (ان کی سرشت میں اس کی معرفت موجود ہے کہ بے شک وہی ان کا رب ہے) پس اس کی بنیاد پر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آتیں انسانی وجود میں شامل خدا کی فطری معرفت پر دلالت کرتی ہیں۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ فطری معرفت کے دو عنوانات ہیں ایک تو خدا کی عاقلانہ معرفت جو کلی مفاہیم کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اور دوسرے خدا کی

---

[1] کافی ج ۲ ص ۱۱، ۱۲ و بحار الانوار ج ۳ ص ۲۷۶ – ۲۷۹

[2] بحار الانوار ج ۳ ص ۲۷۹

حضوری و شہودی معرفت جو قلبی مشاہدہ اور رویت دل کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے ۔ اور اس طرح کی قلبی، حضوری اور شہودی معرفت انسان کے اندر، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، موجود رہی ہے اور اس کا اثر اب بھی ہم میں باقی ہے چنانچہ جب ہم خدا کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ معرفت تمام عذر برطرف کر دیتی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے کوئی جب کسی ایسے ماہر معمار کے تعمیری آثار دیکھتا ہے جس کو خود بھی وہ پہلے دیکھ چکا ہے، فوری طور پر اس معمار کی شخصیت اس کے سامنے آجاتی ہے۔ اب اس کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ یہ عمارت کسی اور معمار کی بنائی ہوئی ہے ۔ حتیٰ کہ وہ بت پرست بھی کہ جس کو غفلت و گمرہی، مادی دنیا سے لگاؤ اور مادی اسباب کی لگن نے اگرچہ اس فطری معرفت کے سلسلہ میں کمزور و ضعیف کر دیا ہے، لیکن جس وقت بھی وہ عبادت و پرستش کی طرف مائل ہوا اور عقلی وسیلوں کے ذریعہ یا انبیاء کے انذار و تبلیغ کے ذریعہ، اس کی فطرت اس پر منکشف ہوگئی تو اب اس کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں ہے کہ میں نے سوچا تھا زمین و آسمان کا خالق پتھر سے تراشا ہوا ایک بت ہے، جب یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ایسے کی عبادت کرنا چاہئے جو کائنات کا نظام چلا رہا ہے اور جس کی ذات سے یہ دنیا قائم ہے اور اس کو پہلے دیکھ بھی چکے ہیں، پہچانتے بھی ہیں تو اب اس کو کسی اور پر تطبیق کرنے کا حق نہیں رہ جاتا، یہی چیز ہے جو اب ہر طرح کے عذر کو ختم کر دیتی ہے اگر مشرک کہتا ہے : ۔

"انما اشرک اٰبائنا من قبل و کنّا ذریۃ من بعدھم"

ہمارے باپ دادا مشرک تھے ہم ان کی اولاد تھے ان ہی کی پیروی کرنے لگے (اس میں ہمارا کیا قصور ہے ؟) (اعراف / ۱۷۳)

تو ان سے کہتے ہیں کہ: تم عقل و شعور رکھتے ہو، پہلے خدا کو پہچان چکے تھے، تمہارا دل اس سے آشنا تھا، تمہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ وہ بت جو خرمہ، کشمش (یا کسی بھی مادہ) سے بنایا گیا ہو، قابل پرستش ہے۔ اس لئے کہ وہ ذات جو عبادت کی مستحق ہے، اس کو تم پہچان چکے ہو، تمہارا دل اس سے آشنا ہے، یہی وہ چیز ہے جو ہر طرح کے عذر اور بہانے کا سد باب کرتی ہے۔

بنا برایں، ان آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ خداوند عالم ـــــ کی نسبت علم حضوری و شہودی کے معنی میں خدا کی فطری معرفت ہر انسان کے اندر موجود ہے ۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ معرفت نیم گاہی

جیسی ہے اور عوام الناس اپنی عادی زندگی ہیں، اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، البتہ جس وقت مادی چیزوں سے انسان قطع تعلق کر لیتا ہے اور اپنے دل میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو یہی نیم آگاہی، آگاہی کی سرحد میں پہنچ جاتی ہے، اور اولیاء اللہ کی ذات میں اس منزل پر پہنچ جاتی ہے کہ وہ آواز دیتے ہیں:-

"ایکون لغیرک من الظھور مالیس لک...[1]"

(آیا کوئی اور چیز تجھ سے زیادہ روشن و آشکار ہو سکتی ہے)

"ماکنت اعبد ربا لم اره"[2] (میں اس کی عبادت نہیں کرتا جسے نہ دیکھا ہو)

اور شاید بہت سی قرآنی آیات کا مقصد بھی اسی فطری معرفت سے آگاہ و آشنا بنانا ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے قلوب اپنے خدا سے قریب ہو سکیں: مثلاً سورۂ انعام کی آیت ۹۵ میں حیات و موت کو وجود عطا کرنے والے کی طرف توجہ دلانے کے بعد خدا فرماتا ہے:-

"ذلکم اللہ فانّی تؤفکون"

(وہی تمہارا خدا ہے تم کدھر بہکے جا رہے ہو)

گویا زندہ موجودات کے بارے میں غور و فکر خود دل کو دعوت دیتی ہے کہ انسان کارخانہ طبیعت میں دست قدرت کی کارستانی کا مشاہدہ کرے اور اس میں خدا کے حضور کو پالے اسی طرح سورۂ انعام کی ہی آیت / ۱۰۲ میں بعض الٰہی نشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد خدا فرماتا ہے:-

"ذلکم اللہ ربکم لا الٰہ الا ھو"

(لوگو! وہی اللہ تمہارا رب اور پروردگار ہے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے)

فطری توحید کا خلاصہ

معرفت خدا کے فطری ہونے کا جو مطلب ہم نے بیان کیا ہے دراصل ہستی عطا کرنے والے خالق کے ساتھ انسان کے وجودی رابطہ کی حکایت کرتا ہے اور اس طرح کی معرفت کہ مخلوق میں اس کے

---

[1] مفاتیح الجنان، دعائے عرفہ امام حسین علیہ السلام

[2] اصول کافی ج ۱ ص ۹۸ (مطبوعہ: دار الکتب الاسلامیہ)

ادراک کی صلاحیت موجود ہو، اس سے جدا ہونے والی چیز نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو لفظ فطری سے تعبیر کرنا مکمل طور پر درست ہے۔ یہ علم شہودی صرف خالق کے "وجود" سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کے تمام پہلوؤں منجملہ ان کے اس کی ربوبیت سے بھی تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ آیہ میثاق میں لفظ "رب" کا استعمال خود اس بات پر شاہد ہے یعنی اس "مشاہدہ" کے ذریعہ خدا کا وجود اور اس کی ربوبیت دونوں ثابت ہوتے ہیں اور اگر اس طرح کا وجودی رابطہ انسان اور کسی دوسرے وجود کے ساتھ پایا جاتا ہوتا تو ضرور مشاہدہ میں آتا پس معلوم ہوا کہ یہ معرفت خدا کی وحدت و یکتائی سے بھی تعلق رکھتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس مشاہدہ نے شرک کے لئے عذر کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی ہے:۔ "او تقولوا انما اشرك"... (اعراف/۱۷۳)

اور چونکہ الوہیت و معبودیت صرف خالق و رب کے لئے زیب دیتی ہے اس لئے ثابت ہوجاتا ہے کہ اس اللہ کے سوا، جس کا فطرت مشاہدہ کرتی ہے، کوئی بھی عبادت و پرستش کا مستحق نہیں ہے، اور اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خالقیت و ربوبیت اور الوہیت و معبودیت میں توحید ایک فطری امر ہے۔

کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول چند روایتوں کے مطابق حضرت آیۂ فطرت کے ذیل میں فرماتے ہیں:۔

"فطرهم على التوحيد"

(لوگوں کی فطرت توحید پر استوار ہے)

اور شاید سورۂ یٰسین کی ۶۰ ویں آیت میں بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

الم اعهد اليكم يا بنى آدم ان لا تعبدوا الشيطان انه لكم عدو مبين وان اعبدونى هذا صراط مستقيم

اے آدم کی اولاد! کیا میں نے تم کو حکم نہیں دیا تھا کہ ہرگز شیطان کی پرستش نہ کرنا، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اور یہ کہ صرف میری عبادت کرنا ہی سیدھا راستہ ہے۔

اور انسانی ذہن کو قریب کرنے والی بات یہ ہے کہ راہ راست وہی ہے جس کی خود انسانی فطرت نشان دہی کرتی ہے اور وہ خدائے یکتا کی پرستش و عبادت ہے دوسرے کسی بھی معبود کی پرستش گمراہی اور فطرت کے سیدھے راستہ سے انحراف کے مترادف ہے۔

ولی امر مسلمین

حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای مدظلہ

نے فرمایا

"عالمی استعماری طاقتوں نے، جو آج عراق کے خلاف کھڑی نظر آتی ہیں، علی الاعلان اعتراف کر لیا ہے کہ زمانہ گزشتہ میں ان کی طرف سے عراق کی مدد کا اصل مقصد اسلام اور ایران کے اسلامی انقلاب کو نابود کرنے نیز عوامی اسلامی تحریک سے خوف و دشمنی کے تحت تھا۔"

"عالمی استکبار پر اسلامی انقلاب سے اس لئے خوف و ہراس طاری ہے کہ مسلمان قومیں تین برّاعظم ۔ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے اتصالی نقطوں اور دنیا کے اہم ترین قدرتی ذخیروں پر اختیار رکھتی ہیں ..... اسلامی معاشروں کی بیداری نے ان کے دو قطبی تسلط اور زبردستی کی سیاست کو خطرے میں ڈال دیا ہے لہٰذا امریکہ کی اسلامی انقلاب سے گہری دشمنی کی بنیاد بھی یہی چیز ہے اور یہ دشمنی ختم ہونے والی نہیں ہے ....."

"ہم خلیج فارس میں امریکہ کی روز افزوں لالچ اور شرم انگیز سیاست کے شدید مخالف ہیں، .... پہلی منزل میں، علاقہ کی سلامتی اور امنیت خود علاقہ کی قوموں کی ذمہ داری ہے، ہم پہلے کی طرح آج بھی خلیجی ممالک کے ساتھ امن و امان برقرار کرنے، اور دوسروں کے حقوق پر حملہ آور ہونے والے ہاتھوں کو قلم کرنے کا اعلان کرتے ہیں .... مسلمان ملتیں اس علاقہ میں امریکی دفاعی امنیتی نظام کی تشکیل کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتیں، زیادتیوں لالچوں، سازشوں اور خلیج فارس سے امریکہ کو نکال باہر کرنے کی راہ میں ہر طرح کا مقابلہ اور جنگ جہاد فی سبیل اللہ کا عنوان رکھتی ہے اور جو بھی اس راہ میں مارا جائے شہید ہے۔"

اقتباس از:

"ایرانی آزاد مجاہدین سے خطاب"

۱۲ر ستمبر ۱۹۹۰ء

افکار امام خمینیؒ کی روشنی میں
سیرت طیبہ کے چند نقوش

جناب سید احتشام عباس زیدی

قرن حاضر کے بے مثل رہنما امام خمینیؒ گو آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی پیغمبرانہ سیرت اور مرسلانہ کردار عہد حاضر میں اسلام و قرآن کی تجدید حیات کا سبب بنا ہے بلاشبہ آپ کی ذات نے اسلام کے نیم جان پیکر میں حیات کی نئی روح پھونک کر اسلام اور اہل اسلام کو ایک بلند و باوقار زندگی عطا کردی۔ آج انہوں نے سرزمین ایران پر پرچم توحید کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ کفر و نفاق کے نجس ہاتھ اس تک پہنچنے سے قاصر ہیں اور اسلامی جمہوریہ کی شکل میں ایک ایسا مستحکم نظام دنیا کے سامنے پیش کیا ہے کہ اس کے سامنے دنیا کے تمام خود ساختہ مکاتب فکر کے دم گھٹتے نظر آتے ہیں آخر ایک نحیف الجثہ انسان کے اندر اتنی طاقت و ہیبت، عزم و حوصلہ، وقار و سکینہ، رعب و داب، شجاعت و شہامت پامردی و ثابت قدمی، عاجزی و انکساری، بے نیازی و سربلندی، غیرت و حمیت، دیانت اور للّٰہیت کہاں سے آئی۔ راز یہ ہے کہ خود امام خمینیؒ نے سیرت طیبۂ رسول اکرمؐ کو اپنی سیرت و کردار حتیٰ اپنی رگ و پے میں اس طرح سمو لیا تھا کہ آج جب ہم ان کی حیات ان کی تبلیغی زندگی، ان کے کامیاب نصب العین نیز ان کی جنگ و صلح اور اس کے درخشاں نتائج پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں سیرت طیبۂ پیغمبر اسلامؐ اور امام خمینیؒ کی زندگی میں ایسی خوشگوار اور حیرت انگیز مماثلتیں نظر آتی ہیں کہ انسان انگشت بدنداں رہ جائے گویا غلام نے اپنے آقا کی سیرت کو اپنی روح میں اتار لینے کے لئے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کو اپنا آئینہ بنا لیا تھا۔

جو لوگ اسلامی انقلاب اور اسلامی جمہوریہ کو سمجھنے میں اب بھی تردد کا شکار ہیں دراصل انہوں نے مرسل اعظمؐ کی حقیقی سیرت طیبہ کو سمجھنے میں کوتاہی سے کام لیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جس دن سیرت رسول اکرمؐ کے واقعی نقوش اہل عالم کے سامنے اجاگر ہو جائیں گے، اس دن نہ صرف یہ انقلاب سمجھ میں آجائے گا بلکہ اس دن ساری دنیا میں صرف اسلام اور قرآن کا بول بالا ہوگا۔

بلا شبہ یہ دنیا کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ نہ صرف دنیا سے بلکہ خود مسلمانوں سے بھی اسلام کے حقیقی نقوش مخفی رکھے گئے اور اس کا واقعی چہرہ ارباب ظلم وجور کے ذریعہ ہمیشہ چھپایا گیا تاکہ دنیا حقائق سے آشنا نہ ہو سکے۔ چنانچہ امام خمینی فرماتے ہیں:۔

"انہوں نے برسوں اس بات کی کوشش کی ہے کہ اسلام کو مخفی رکھیں، اسلام اپنی اصل شکل میں سامنے آنے نہ پائے، اگر اسلام اپنی واقعی شکل میں پیش کیا گیا تو دوسرے مکاتب پیچھے رہ جائیں گے۔ دوسرے مکاتب شکست سے دوچار ہو جائیں گے ...... انہوں نے ایک طویل عرصہ تک منصوبے بنائے اور اسلام جیسا کہ یہ اصل میں تھا لوگوں سے چھپا دیا حتیٰ خود مسلمانوں سے بھی ...." صحیفۂ نور، ج ۵، ص ۲۸۱

چشم و ابرو، کاکل و گیسو، رخ و رخسار سے الگ ہٹ کر مرسل اعظم کا صدق گفتار اور حسن کردار بھی ہے جو انسان ساز بھی ہے اور حیات بخش بھی۔ پیغمبر اکرمؐ ظلم وجور کا شکار حالات کے مارے تو ہمات میں گرفتار ابن الوقتوں کے اسیر انسانوں کو نجات عطا کرنے کے لئے تشریف لائے تھے قرآن نے اس کی حکایت یوں فرمائی ہے: "ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم" (اعراف/۱۵۷)

وہ کفر و ضلالت کے اندھیروں میں گم انسانوں کو نور کی دنیا میں لانے ان کے سامنے خدا کی نشانیاں پیش کرنے ان کے نفوس کو پاک کرنے اور انھیں علم و حکمت کی دولت سے مالا مال کرنے تشریف لائے تھے لقد منّ الله علی المومنین اذ بعث فیهم رسولا من انفسهم یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین (آل عمران/۱۶۴)

وہ انسانوں کو الٰہی اخلاق سے آراستہ کرنے کے لئے انک لعلی خلق عظیم (القلم/۴) کا لباس زیب تن کرکے آئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ حیات طیبۂ پیغمبر اکرمؐ کا گوشہ گوشہ جہاں آرا و بشر ساز ہے لہٰذا لازم ہے کہ ہم ان تمام گوشوں کو حقیقی عینکوں سے دیکھنے کی کوشش کریں۔

یوں تو موضوع اپنے دامن میں بڑی وسعت رکھتا ہے لیکن ہم اختصار کے ساتھ حیات پیغمبر اسلامؐ کے صرف چند اہم گوشوں کی طرف امام خمینیؒ کے افکار کی روشنی میں ایک اشارہ کرنا چاہتے ہیں جس سے حیات پیغمبرؐ اعظم کے ان گوشوں پر ایک نئے عنوان سے روشنی پڑتی ہے۔

ولادت پیغمبر شکست ظلم و شرک کی بنیاد: کائنات میں لاکھوں افراد روز پیدا ہوتے رہتے ہیں

اور یہ ایک عام و فطری سی بات ہے لیکن بعض ولادتیں نہ صرف ایک محدود معاشرہ و ماحول پر اثر انداز نہیں ہوتیں، بلکہ ان کا اثر وسیع پیمانہ پر محسوس کیا گیا ہے حبیب خدا پیغمبر اکرمؐ کی ولادت باسعادت کی شان سب سے جدا اور منفرد ہے ایک طرف آپ کی ولادت خیرات و برکات کا سرچشمہ نظر آتی ہے اور دوسری طرف ظلم و شرک کی نابودی کا مظہر بھی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی ولادت کا عہد وہ عہد ہے جب ظلم و شرک جیسی دو بڑی قوتیں کائنات میں موجود تھیں۔ آپ کی ولادت چونکہ عدل و توحید کا سرچشمہ تھی لہذا ان دونوں قوتوں پر پوری طرح اثر انداز ہوئی چنانچہ امام خمینیؒ فرماتے ہیں:۔

"ولادتیں مختلف ہوتی ہیں ایک ولادت خیرات و برکات کا مبدأ ہے ظلم کو نابود کرنے کا سرچشمہ ہے، بت کدوں کو ڈھانے اور آتش کدوں کے خاموش ہونے کی بنیاد ہے جیسے رسول اکرمؐ کی ولادت باسعادت کہ جس کے لئے بیان کیا گیا ہے کہ اس کے سبب فارس کا آتش کدہ گل ہو گیا اور طاق کسریٰ کے کنگرے گر پڑے (یہ تو تاریخ کا بیان ہے) لیکن مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں دو قوتیں تھیں ایک ظالم حکومت اور دوسرے آتش پرست روحانی طاقتیں پیغمبر اسلامؐ کی آمد اور ان کی ولادت ان دونوں قوتوں کی شکست کا سرچشمہ تھی..... اور یہ دو اصلیں یعنی توحید و عدل پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ عالم میں رائج ہو چکیں اور انشاءاللہ ہو رہی ہیں۔" (صحیفہ نور، ج ۲، ص ۲۱۴)

بعثت پیغمبر اکرمؐ: سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ انبیاء الٰہی کن بنیادوں پر مبعوث کئے گئے اور کس لئے اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں یہ ہماری کوتاہ فکری رہی ہے یا پھر ہمارے دشمنوں کی دشمنی و عیاری کہ ہم کما حقہ انبیاء کرامؑ کی بعثت کے مقاصد سے آشنا نہ ہو سکے اور نامکمل طور پر دستیاب صرف چند تاریخی واقعات اور ضمنی اخلاقی کردار و سیرت کو ان کی نبوت و رسالت کا مقصد سمجھتے رہے جبکہ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ انبیاء کرامؑ کی بعثت و رسالت کا مقصد لوگوں کو علم و آگاہی کی روشنی بخشنا، ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنا اور عدل و انصاف قائم کرنا بیان کیا ہے: لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (حدید ۲۵) (یعنی ہم نے انبیاء کو روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب اور حق و باطل کی میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل و انصاف قائم کریں)۔ امام خمینی قدس سرہ کے افکار میں بھی بعثت انبیاءؑ کی یہی تجلیاں نظر آتی ہیں آپ نے مختلف مقامات پر فرمایا کہ انبیاءؑ ظلم سے ٹکرانے اس کا سر کچلنے اور دیانت و عدالت قائم کرنے کے لئے تشریف لائے اور ہر نبی کا یہ فریضہ تھا کہ اپنے عہد میں ظلم کے خلاف آواز اٹھائے مظلوموں کو نجات بخشے اور

استعماری طاقتوں کا قلع قمع کرے ، امام خمینیؒ کے الفاظ میں :۔

"آپ جناب ابراھیمؑ کو ملاحظہ فرمایئے انہوں نے اپنا تیشہ اٹھایا اور ان تمام بتوں کو جو امیروں اور بڑے لوگوں کے تھے توڑ ڈالا اور اپنے زمانہ کے قوی لوگوں سے عوام کی بھلائی کے لئے ٹکرا گئے تاکہ یہ لوگ عام انسانوں پر ظلم نہ کرنے پائیں ..... جب یہ حضرات دیکھتے تھے کہ معاشرہ پر ظلم ہو رہا ہے تو وہ ظالموں سے ٹکرانے اور جس طرح بھی ممکن ہو ان سے جنگ کرنے کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔" (صحیفہ نور، ج ۲، ص ۱۶۵)

"حضرت موسیٰؑ نے اپنا عصا اٹھایا اور فرعون سلطان مصر سے ٹکرا گئے، بادشاہ مصر کی طرف سے خود عوام کو خواب خرگوش میں سلایا نہیں بلکہ اپنے اسی عصا اور اپنی تبلیغات کے ذریعہ اپنے عہد کے ظالم بادشاہ کے خلاف عوام کو لا کھڑا کیا۔"

(صحیفہ نور ج ۲، ص ۱۶۵)

پیغمبر اسلامؐ بھی انبیاء ماسلف کی مانند اسی مقصد کے تحت مبعوث ہوئے چنانچہ آپؐ کی پوری زندگی جہاد و کارزار کی زندگی ہے مکہ میں بعثت سے ہجرت تک اور مدینہ میں زندگی کے آخری لمحات تک اسی مقصد کو پیش نظر رکھا کہ ظلم کے خلاف قیام کریں اور دیانت و عدالت کو رواج بخشیں۔ چنانچہ امام خمینیؒ فرماتے ہیں :۔

"جب پیغمبر اکرمؐ حجاز میں تھے تو ابتداء میں انھیں جن طاقتور افراد سے سابقہ تھا ان میں سے ایک گروہ مکہ میں تھا جو بہت مضبوط اور قوی تاجروں کا تھا، ایک گروہ طائف میں تھا یہ اس علاقہ کے دولت مند اور طاقتور افراد تھے ابوسفیان اور ان کے جیسے یہ سب حکام و سلاطین کے مانند تھے اور ان کے پاس سب کچھ تھا پیغمبر اسلامؐ ان سے ٹکرا گئے جب مدینہ تشریف لائے تو بھی فقراء کے ساتھ رہے۔ ...... اور انہوں نے ان ہی غریب انسانوں کو ان امیروں کے خلاف صف آرا کر دیا جو عوام کا مال کھاتے تھے اور عوام پر ظلم کرتے تھے۔" (صحیفہ نور ج ۲، ص ۱۶۵)

اور یہی وہ سیاست الٰہیہ تھی جو تمام انبیاءؑ اور خود پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کا بنیادی مقصد رہی ہے۔ آج مسلمان اسی مقصد کو فراموش کر چکا ہے، مقصد رسالت کو بھول گیا ہے، اسلام مخالف طاقتوں نے ہمیں اسلام و قرآن سے اس قدر دور کر دیا ہے کہ اب خود مسلمان اسلام کے خلاف جنگ پر آمادہ ہو گیا اور اس بات کی طرف ملتفت نہیں ہے کہ اسلام مخالف افکار مثلاً اسلام کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہے! وہ زندگی کے موجودہ مسائل کو حل نہیں کر سکتا! اسے سیاست سے کیا سروکار وہ تو صرف ایک عبادی مذہب ہے!! دراصل یہ باتیں اسلام کے خلاف اعلان جنگ ہیں۔

ہجرت پیغمبرؐ کے تاریخ : پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت بھی اپنے آپ میں ایک انوکھی فکری جاذبیت رکھتی ہے۔ دراصل یہ تاریخ اسلام کا وہ اہم باب ہے جس نے اسلام کو صبح قیامت تک کے لئے آفاقی دین بنا دیا۔ جب ہم ہجرت سے

پہلے کی اسلامی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو مکہ کی محدود فضا میں اسلام اتنا تنہا اور بے یار و مددگار تھا کہ ذلت و اہانت فقر و فاقہ، غربت و تنگدستی، ظلم و بربریت طوق و زنجیر، تازیانوں، اذیتوں اور شہادتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور کسے معلوم تھا کہ مظلوموں کی سسکیاں اور آہیں ایک دن گلشن اسلام میں عالمی پیمانہ پر عدل و انصاف اور اخوت و محبت کے معطر پھول کھلائیں گی۔ مکہ کی زندگی کا اسلام علاقائی فضاؤں میں محدود صرف ایک عبادی اسلام نظر آتا ہے جبکہ مدینہ کا اسلام پورے انسانی معاشرہ پر محیط طاقت و قوت اور فتح و ظفر اور بخشش و درگزر کا اسلام ہے۔ امام خمینیؒ فرماتے ہیں :-

"رسول اکرمؐ مدینہ ہجرت کرنے سے پہلے جب آپ مکہ میں زندگی بسر کرتے تھے تو آپ کا کام صرف خدا کی طرف دعوت دینا، ذات اقدس پروردگار کی معرفت کرانا اور اسلام کو پہچنوانا آپکے پاس ناصر و مددگار نہیں تھے جن کی مدد سے آپ مشرکین سے جنگ کرتے اور اسلام کو وسعت بخشتے۔ اور جیسا کہ آپ قرآن میں ملاحظہ فرماتے ہیں جو سورے مکہ میں نازل ہوئے ہیں ان میں صرف موعظہ و نصیحت اور اسلام کے تعارف کا پہلو پایا جاتا ہے اور جہاد و جدال کی کوئی بات سامنے نہیں آتی نیز احکام بھی ان میں کم ہی ذکر ہوئے ہیں۔ عام انسان جو سطحی فکر رکھتے ہیں یہ پیشین گوئی کرہی نہیں سکتے تھے کہ ہجرت کتنی مصلحتیں اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے لیکن جب آپ مدینہ تشریف لے گئے تو معلوم ہوا کہ آپ کی ہجرت سے کیسے نتائج برآمد ہونے والے تھے اور آپنے کس طرح اسلام کو مدینہ میں وسعت بخشی کام آنے والے جاں نثار پیدا کئے اور آخر کار فتح و ظفر کے ساتھ مکہ واپس ہوئے اور وہی قریش کے طاقتور افراد ان کے سامنے جھکے اور آپنے انھیں آزاد کر دیا" (صحیفۂ نور ج ۱۸ ص ۸۲)

وحدت کلمہ : بانیٔ اسلام پیغمبر اکرمؐ کی سب سے بڑی آرزو اتحاد اور وحدت کلمہ رہی ہے اصل میں توحید کی روح بھی یہی ہے اور پیغمبرؐ اسی روح کو پورے عالم میں پھونکنا چاہتے تھے مسلمانوں کو اتحاد و یگانگت کی دعوت دینا آپ کا سب سے اہم اقدام تھا اور آپ اس نکتہ پر بھرپور زور دیتے تھے۔ اسی مقصد کے تحت آپنے مدینہ پہنچنے کے فوراً بعد جو پہلا اہم اقدام فرمایا تھا وہ مسلمانوں کے درمیان اور انصار و مہاجرین کے درمیان بھائی بھائی کا رشتہ قائم کرنا تھا۔ اپنے اس عملی اقدام کے علاوہ پیغمبر اسلامؐ کی متعدد وحدت آفریں حدیثیں بھی اتحاد کی دعوت دیتی ہیں "کل مسلم اخوة" یعنی تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں" اسلام کا سب سے زیادہ زندہ اور جیتا جاگتا نعرہ ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہماری اسی اصل پر سب سے زیادہ ضرب لگائی گئی۔ پیغمبر اسلامؐ پوری کائنات میں وحدت کلمہ کی روح پھونکنا چاہتے تھے تا کہ گلستان آدمیت میں اختلاف کے خلا پیدا ہی نہ ہو سکیں لیکن زمانہ کی ابن الوقت طاقتوں نے ایسا نہ ہونے دیا اور عالم اسلام کو اپنی ہوسناکیوں کا نشانہ بنا کر وحدت کلمہ کی راہ کے پتھر بنے رہے۔ امام خمینیؒ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں :-

"پیغمبر اسلامؐ چاہتے تھے کہ تمام دنیا میں اتحاد و یگانگت قائم کریں، آپ چاہتے تھے کہ دنیا کے تمام ممالک اور تمام ربع مسکون

کو کلمہ توحید کے زیر سایہ قرار دیا لیکن اس وقت کے ظالم سلاطین اور خود غرض یہود و نصاریٰ سد راہ ہو گئے۔" (صحیفہ نور ج ۱۲۰)

آج اگر ہم چاہتے ہیں کہ عالم اسلام کو اس آشفتگی اور زبوں حالی سے نجات دلائیں تو ہمیں چاہیئے کہ اسلام کی اس روح کی طرف خاص توجہ دیں۔ یہ وحدت کلمہ ہی ہے جو ہمیں سر بلند کر سکتی ہے ہمارے دیرینہ دشمنوں سے ہمیں نجات عطا کر سکتی ہے یہ وحدت کلمہ ہی ہے جو ہمارے لئے سعادت دنیا و آخرت کا سرچشمہ بن سکتی ہے۔

مسجد اسلامی سیاست کا مرکز: حیات طیبۂ پیغمبر اسلامؐ کا یہ وہ گوشہ اور عالم اسلام کا وہ حیاتی پہلو ہے جسے اسلام دشمنوں نے سب سے زیادہ مسخ کیا ہے۔ اسلام کو سیاست سے علیٰحدہ کر کے انہوں نے نہ صرف دین کو محدود اور ناقص بنا کر پیش کیا ہے بلکہ ہمارے ذہنوں سے ہمارے دینی مراکز کا حقیقی وقار بھی محو کر کے رکھ دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی مندر اور گرجہ گھر کی مانند آج مسجد بھی صرف ایک محترم عبادت خانہ بن کر رہ گئی جہاں بندہ انفرادی طور سے اپنے خدا سے ارتباط پیدا کرے اور دنیا و مافیہا سے غافل رہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ میں سب سے پہلا اور اہم اقدام یہ فرمایا کہ ایک مسجد کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کو اپنے تمام دینی، اجتماعی، سیاسی، نظامی و معاشی مسائل کے حل کے لئے مسجد میں آنے کی دعوت دی اور اسے صرف عبادت کا مرکز بنانے کے بجائے اسلامی سیاست کا مرکز قرار دیا۔ جب تک مسلمان رسول اسلامؐ کی سیرت طیبہ کی روشنی میں مسجد کے اسی بنیادی پہلو سے استفادہ نہ کریں گے، دشمن ان پر غالب رہے گا۔ امام خمینیؒ نے عالم عیسائیت کو مخاطب کرتے ہوئے اسلام میں مسجد کی اہمیت کو یوں واضح فرمایا ہے:

"عیسائی یہ خیال نہ کریں کہ مسجد بھی کلیسا کی مانند ہے، مسجد میں اگر نماز قائم ہوتی تھی تو اس میں لوگوں کے فرائض بھی معین کئے جاتے تھے، وہیں جنگوں کے منصوبے طے کئے جاتے تھے، ممالک کے انتظام کا بنیادی ڈھانچہ مسجد ہی میں تیار ہوتا تھا، مسجد کلیسا جیسی نہیں ہے، کلیسا (ان کے خیال میں) افراد اور خداوند عالم کے درمیان ایک فردی رابطہ ہے لیکن پیغمبر اسلامؐ اور ان کے خلفاء ..... کے زمانہ میں مسجد اسلامی سیاست کا مرکز رہی ہے، جمعہ کے دن نماز جمعہ کے خطبوں میں سیاسی مسائل، جنگ سے مربوط مطالب اور سیاست مدن جیسے تمام مسائل مسجد میں ہی طے ہوا کرتے تھے۔" (صحیفہ نور ج ۱۱۹)

اگرچہ ان تمام موضوعات پر لکھنے کے لئے دفتر درکار ہیں لیکن اختصار اور کوتاہ قلمی کے پیش نظر ان پر محض ایک ہلکا سا اشارہ ہی کیا جا سکا ہے امید ہے کہ قارئین کرام اس قطرہ میں سمندر کی توانائی کا احساس کرتے ہوئے اس کے آب زلال سے اپنی روح کو خنکی و طراوت بخشیں گے۔

خداوند عالم ہمیں زیادہ سے زیادہ سیرت طیبۂ پیغمبر اکرمؐ پر چلنے اور ان کے فرزند امام خمینیؒ کے روحانی افکار سے فائدہ اٹھانے کی توفیق کرامت فرمائے۔

فرعونی آمریت کے خلاف

اسلامی اصولوں کی فتح

از جناب سیّد ولی الحسن رضوی

حکومت عراق کی جانب سے الجزائر کے معاہدہ ۱۹۷۵ء کی قبولیت، جنگی قیدیوں کی رہائی سے موافقت اور ۲ ہزار ۴ سو کلو میٹر ایرانی سرزمین سے عراقی افواج کی مراجعت اگر سچ پوچھئے تو صرف اسلامی جمہوریۂ ایران کی فتح نہیں ہے بلکہ جبر و استبداد پر مبنی تمام شیطانی قوتوں اور ان کی فرعونی آمریت کے خلاف حق و عدالت، استقلال و حریت، جہاد و شہادت اور صبر و استقامت جیسے عظیم اسلامی اصول و اقدار کی فتح ہے، آٹھ سال کی مسلسل جنگ اور دو سال "نہ صلح نہ جنگ" جیسی غیر یقینی کیفیت کے بعد خود عراقی صدر صدام حسین کی طرف سے اسلامی جمہوریۂ ایران کی فتحیابی کا اعلان ـــ حق و عدالت کی راہ پر گامزن تمام انقلابی مسلمانوں کی جانب سے کبر و نخوت میں چور فرعونی کھوپڑیوں پر پڑنے والی وہ کاری ضرب ہے، جو عالمی شیطانی قوتوں اور ان کے صدام صفت آلہ کاروں کے حواس بجا کرنے کے لئے کافی ہے۔

ہم، حق و عدالت کی راہ میں حکومت ایران کے اسلامی و اصولی موقف کی وضاحت اور عراق کی باطل حکومت کے اعتراف شکست کو ایک تاریخی دستاویز کی شکل میں باقی رکھنے کے لئے صدر جمہوریۂ ایران حجۃ الاسلام والمسلمین جناب ہاشمی رفسنجانی دام ظلہ کا خط صدام کے نام اور صدر جمہوریۂ عراق صدام حسین کا جوابی خط ایرانی صدر کے نام من و عن ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں، آخر میں ہم بین الاقوامی سطح پر اسلامی جمہوریۂ ایران کی فتح کے اعترافات کا مختصر خاکہ بھی پیش کریں گے۔

صدر اسلامی جمہوریہ ایران کا خط صدام کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد نبیہ وآلہ الاطہار

جناب آغائے صدام حسین صدر جمہوریہ محترم!

مورخہ ۶۹/۵/۱۲ (۳، اگست ۱۹۹۰ء) کا روانہ کردہ آپ کا خط موصول ہوا، باوجود اس کے کہ بظاہر خط کا اصل مقصد صلح سے متعلق گفت وشنید کو آگے بڑھانا ہے پھر بھی اس میں بعض افسوس ناک باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ حق وعدل پر مبنی ایک پائدار صلح برقرار ہونے کے سلسلہ میں جمہوری اسلامی ایران کے مطالبہ اور ارادہ کا تاکید کے ساتھ اعادہ کردوں، امید ہے آپ خود بھی اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہوں گے، ہم نے (اقوام متحدہ کی) قرارداد ۵۹۸ قبول کرنے کے بعد سے ہی صلح اور اس کے نتیجہ میں پیش آنے والے مسائل کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں کامل آگاہی کے ساتھ صدق دل سے کوششیں شروع کردیں، اور بنا اس بات پر رکھی کہ سوائے ان چیزوں کے جو ملت ایران کے جائز اور ناقابل تغییر حقوق سے مربوط ہیں کوئی بھی چیز صلح کی راہ میں ہماری اس پیش قدمی کو محدود نہ کرنے پائے اور ہم نے کیا بھی یہی، اس عرصہ میں اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کی نگرانی میں انجام پانے والی گفتگوؤں کے دوران نیز آپ کے خطوط کے جوابات میں اور جنیوا میں ہمارے اور آپ کے نمائندوں کے درمیان جو گفتگو جاری ہے، اس میں بھی ہمارے انداز اور رویے نے اس مسئلہ کو آپ پر روشن و واضح کردیا ہوگا۔

جنیوا میں، دونوں ممالک کے نمائندوں کے درمیان بات چیت کے ابتدائی مرحلہ میں ہی ہم نے طولانی بات چیت اور خطوط بازی کے بجائے صلح کی برقراری میں سرعت عمل اور قرارداد ۵۹۸ کو بروئے کار لانے کے اقدامات کی ضرورت پر سختی سے تاکید کی تھی اور ہم اب بھی اسی نظریہ کے قائل ہیں کہ گفتگو کی شکل تبدیل کرنے کے بجائے گفتگو کے مطابق موضوعات کو آگے بڑھنا چاہئے وہ مسائل، جو صلح

کے سلسلہ میں کلیدی حیثیت کے حامل ہیں، ان کے بارے میں اپنی صورت حال کی وضاحت ہم کو اپنے ھدف ومقصد سے قریب کرے گی، وہ ھدف، جو موجودہ صورت حال کو درہم وبرہم کر دینے والی بنیادوں یا دشمنان اسلام کی ساختہ وپرداختہ مصنوعی فضا جو اس وقت دنیا اور اس علاقہ کے مخصوص حالات کے تحت پیدا کی جاسکتی ہے ان سب کا سدباب کر دے گا۔

اس صورت میں صلح دونوں ملکوں کی دسترس میں ہو گی، اور ایک دوسرے کے خلاف مصروف فوجیں دونوں ملتوں کے حیات بخش ضروریات کی تکمیل کر سکتی ہیں اور ان کی اصل ذمہ داری تعمیری رخ اختیار کر کے، علاقہ میں صلح وامنیت قائم کر سکتی ہے۔

مذکورہ بالا باتوں کے پیش نظر ۱۲/۵/۶۹ ۱۳ (۳ / اگست ۱۹۹۰ء) کے خط، مورخہ ۱۳۶۹/۵/۸ (۳۰ / جولائی ۱۹۹۰ء) کے بلا دستخط خط اور مورخہ ۲۵/۴/۱۳۶۹ (۱۶ / جولائی ۱۹۹۰ء کے خط میں درج مطالب سے متعلق آپ کو درج ذیل نکتوں کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱ - اس وقت جینوا میں جاری گفتگو سے اعلیٰ سطح پر گفتگو، اسی وقت قبول کی جاسکتی ہے جب کہ جینوا میں جاری گفتگو سے ہم کسی ایسے خاص تاریخ تک پہنچ چکے ہوں جو آئندہ مراحل کے لئے بنیاد بن سکیں لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ جینوا میں سوائے ایک دوسرے کے موقف سے ذرا بہتر آشنائی کے ہم کسی قابل ذکر مرحلہ تک بات آگے نہیں بڑھا سکے ہیں، جب کہ ہمارے اور آپ کے نمائندوں کی ذمہ داری یہ تھی کہ بامعنی مسائل پر گفتگو انجام دیں، ان ہی وجوہات کی روشنی میں، نیز جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، دونوں ممالک کے صدر کے درمیان ملاقات اسی وقت مفید ہو سکتی ہے کہ اہم اور کلیدی مسائل واضح اور حل ہو چکے ہوں، ورنہ دوسری صورت میں دونوں صدروں کے درمیان گفتگو کی ناکامی، ممکن ہے صلح کی برقراری میں نقصان دہ ثابت ہو اور اس کو دونوں ملکوں کی دسترس سے مزید دور کر دے۔

۲ - مورخہ ۸/۵/۱۳۶۹ (۳۰ / جولائی ۱۹۹۰ء) کے خط میں آپ کی طرف سے دریائے اروند کے بارے میں کچھ تجاویز پیش کی گئی ہیں، جن میں اگرچہ گذشتہ بیانات میں کئے جانے والے دعووں سے پیچھے اتر کر بات کی گئی ہے لیکن آپ پر بھی یہ بات اچھی طرح واضح ہے کہ ہم اس کو قبول نہیں کر سکتے، صلح کی گفتگو کے لئے ہماری طرف سے اٹل ومشخص تجویز ۱۹۷۵ء کے معاہدہ کا بنیاد قرار پانا ہے، کیونکہ گذشتہ معاہدوں کی پابندی کئے بغیر، خاص طور پر وہ معاہدہ جس پر خود آپ کے دستخط موجود

ہیں، یہ امید نہیں رکھنا چاہئے کہ جو بات آج کہی جارہی ہے اس پر اعتماد کر لیا جائے۔

۳۔ ایران کے مقبوضہ علاقوں سے (عراقی فوج کی) واپسی کے لئے دو ماہ کی مدت تجویز کی گئی ہے جس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ یہ وہ کام ہے کہ اگر حسن نیت کے ساتھ انجام دیا جائے تو ایک دو روز کے اندر انجام پاسکتا ہے جبکہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے اپنی تجویز میں قیدیوں کی آزادی کے لئے تین ماہ کی مدت کے مقابل اس کام کے لئے دو ہفتہ کی مدت لازم قرار دی تھی۔

۴۔ تعجب کی بات ہے کہ سرزمین کویت پر عراقی فوج کے قبضہ کے خلاف ہماری حق پر مبنی پالیسی سے متعلق اپنی عربیت کی دہائی دیتے ہوئے تنقید سے کام لیا گیا ہے، حالانکہ بدیہی ترین مسائل منجملہ ان کے علاقہ میں وسیع پیمانے پر بیرونی افواج کے وجود کے لئے زمین ہموار کرنا، علاقہ میں بے چینی اور بے اطمینانی کی فضا پیدا کرکے مسلمان عوام کے لئے مشکلات پیدا کرنا، اسلامی بنیاد پر قائم ضمانت اور خبر گیری، ہمسائیگی اور علاقائی ثبات وامن کی پامالی، ملکی سرحدوں کی صورت حال میں تبدیلی اور بین الاقوامی معاہدے، یہ تمام مسائل نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔

بھلا اس بات کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے کہ جس خط کا خداوند تبارک وتعالیٰ کے نام سے آغاز اور الہام آفریں نعرے "اللہ اکبر" پر اختتام ہوا ہو، اس میں اسلام و قرآن کے صحیح اور سچے تعلیمات کے خلاف، نسلی وقومی بنیادوں کو اسلامی وایمانی بنیاد پر مقدم قرار دیا جائے!

قرآن کی یہ محکم آیتیں ... انما المومنون اخوة[1]، ان ھذہ امتکم امة واحدة و...[2]، انا خلقنٰکم من ذکر وانثیٰ وجعلنٰکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم[3]"،

ہر مسلمان کے لئے کافی ہیں کہ وہ اپنی پالیسیوں میں قومی، جغرافیائی اور لسانی دوستی کو اسلامی اصول کے تحت الشعاع قرار دے دے، جنگ کے دوران حکومت کویت کی سیاستیں اور ایران کے اسلامی انقلاب کے تئیں اس کی ظالمانہ روشیں کی حدیں دوسروں سے زیادہ آپ پر روشن ہیں لیکن ہمارا فیصلہ افراد سے تعلقات کی بنیاد پر نہیں بلکہ ہمارے اصول پر استوار ہے۔

---

[1] حجرات/۱۰ (یقیناً تمام مومنین بھائی بھائی ہیں) [2] انبیاء/۹۲ (بے شک یہ تمہاری امت ایک واحد امت ہے اور...)
[3] حجرات/۱۳ (ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو (مختلف) قبیلوں اور برادریوں میں قرار دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان لو، اس میں شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ مکرم وباعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی وپرہیزگار ہے)

۵۔ یقیناً جس وقت دو ملکوں کے درمیان صلح کی بات چیت چل رہی ہو، ایک پڑوسی ملک پر بغیر کسی قسم کی معمولی سی بھی اطلاع اور ہماہنگی کے ناقابل تصور حملہ، اور وہ بھی جب کہ اس سے ہمارے روابط میں غیر معمولی آثار و نتائج مرتب ہو سکتے ہیں، ہمارے اعتماد کو کمزور کر سکتا ہے اور ادھر چند ماہ سے جاری مذاکرات کے مقاصد میں سنجیدہ طور پر شکوک و شبہات پیدا کر سکتا ہے خصوصاً جب کہ اس عرصہ میں ہم نے حسن نیت ظاہر کرنے والے کسی اقدام کا مشاہدہ بھی نہ کیا ہو بلکہ پہلے ہی کی طرح ہماری سرزمین پر قبضہ باقی رکھنے کا اصرار، حتیٰ تیل کے کنووں میں لگی آگ کو بجھانے جیسے معمولی مسئلہ میں آپ کی مخالفت کا ہم نے ضرور مشاہدہ کیا ہے جس سے وطن اسلامی کا سرمایہ تلف ہونے کے سوا آپ کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔

۶۔ آپ کے خط کے آخری حصہ کا لب و لہجہ، گفتگو کو جاری رکھنے کے لئے مناسب انداز کا نہیں ہے، اس میں وہ لہجہ اور زبان استعمال کی گئی ہے جس کا، ایک انقلابی مسلمان ملت کے سلسلہ میں فائدہ مند ثابت نہ ہونا زمانۂ گزشتہ میں آزمایا جا چکا ہے، اور ہمیں قانع کرنے کے لئے خود اپنے گزشتہ دوستوں اور حامیوں کی جدید پالیسیوں کے بارہ میں تجزیہ و تحلیل سے استفادہ کیا گیا ہے جو مناسب نہیں ہے، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ہم عملی طور پر ان تمام مراحل کو آزما چکے ہیں اور ان سے گزر چکے ہیں اور ثابت کر دیا ہے کہ ہم تمام چیزوں سے زیادہ ایمان و استقامت اور عوام کی حمایت کو پیش نظر رکھتے ہیں، اور دوسروں کے قہر و لطف کو اتنی اہمیت کے قابل نہیں سمجھتے کہ زندگی کے منصوبوں، پالیسیوں اور اہم فیصلوں میں ان کو بنیاد قرار دیں، ہم موجودہ صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں بھی نہیں ہیں اور سوائے اپنے جائز اور قانونی حقوق کے کچھ اور نہیں چاہتے، وہی چیزیں جن پر گفتگو کے تمام مراحل میں ہم تاکید کرتے رہے ہیں۔

۷۔ صلح کی راہ میں سرعت عمل سے متعلق آپ کے خط میں جس نکتہ کی طرف تاکید کی گئی ہے ہم اسے کامل طور پر قبول کرتے ہیں لیکن محض زبانی تجویزیں پیش کرنے اور اصل گفتگو کے مطالب میں کوئی نتیجہ حاصل ہوئے بغیر مذاکرات کی سطح کو بلند کرنے سے، صلح میں تیزی پیدا نہیں ہوتی ہے بلکہ ہمیں چاہئے کہ دونوں ملکوں کے ان معاہدوں کی پابندی کریں جنھیں بین الاقوامی نظر میں قانونی حیثیت حاصل ہے اور اپنے جائز حق سے زیادہ کا مطالبہ نہ کریں کیونکہ جو چیز آٹھ سال کی جنگ سے حاصل نہ ہو سکی

مذاکرات کے ذریعہ اس کا حاصل ہونا قابل تصور نہیں ہے، اگر ہم اس بات کو قبول کرلیں، تو زمینی و دریائی سرحدیں معین کرنے کے سلسلہ میں ۱۹۷۵ء کے معاہدے کے بجائے کسی اور چیز کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر قبول نہ کرتے ہوں تو بہتر ہے کہ معاہدے کو عمل میں لانے کا کام اقوام متحدہ اور "امن کمیٹی" پر چھوڑ دیں، اور ضمنی طور پر مشترک مسائل میں نظریات کے ردوبدل کے لئے جنیوا میں قائم نقطۂ ارتباط کو باقی رکھیں۔ والسلام علیکم

اکبر ہاشمی رفسنجانی

۱۶ محرم ۱۴۱۱ ہجری قمری مطابق ۶۹/۵/۱۷ ہجری شمسی

اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر حجۃ الاسلام والمسلمین جناب ہاشمی رفسنجانی مدظلہ کے حق پر مبنی اس صاف اور دوٹوک خط کے جواب میں عراق کے صدر صدام حسین نے ۱۹۷۵ء کے الجزائر معاہدہ کو تسلیم کرلیا۔ اور جناب ہاشمی رفسنجانی کے نام صدام کا مندرجہ ذیل خط ۲۳ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۵ اگست ۱۹۹۰ء کو بغداد ریڈیو سے نشر کیا گیا۔

صدّام کا خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت صدر جمہوریہ علی اکبر ہاشمی رفسنجانی! صدر جمہوریہ اسلامی ایران۔

خداوند عظیم پر توکل کے بعد، تمام مسلمانوں خاص طور پر پڑوسی ملک ایران کے مسلمان بھائیوں کے ساتھ برادرانہ روابط کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو برطرف کرنے کی نیت سے نیز تمام مومنین کو، ان تمرلسندوں کے مقابل کہ جو مسلمانوں اور عرب قوموں کو ضرب لگانا چاہتے ہیں، سنجیدگی کے ساتھ فعال اور ہماہنگ کرنے کے لئے اور اسی طرح ایران و عراق کو بین الاقوامی تمر پسند طاقتوں اور ان کے علاقائی آلۂ کار کے کھلواڑ اور شاطرانہ حرکتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اور ۱۲ اگست ۱۹۹۰ء کو علاقہ میں ہمہ جہت دائمی صلح برقرار کرنے کے لئے ہم نے جو اعلان کیا ہے اس کی بنیادی روح سے ہماہنگی ظاہر کرنے کے لئے جیسا کہ اس خط میں ہم نے علاقہ میں ایک ہمہ جہت دائمی صلح کی خواہش کی تھی، اور اس لئے بھی کہ آپسی تعاون میں رکاوٹ اور غلط فہمی کا موجب بننے والے ہر طرح کے بہانے دور ہوجائیں، نیز عراقی

وسائل عظیم تقابلہ آرائی کے میدان سے دور معطل نہ پڑے رہیں، اور ان کو ان مقاصد کی راہ میں استعمال کیا جا سکے جن پر تمام مسلمان اور شریف حق پسند عرب متفق ہیں نیز ایسی محاذ آرائیوں، کینوں اور دشمنیوں سے دوری کے لئے اور اس لئے بھی کہ خیر خواہ افراد عادی روابط دوبارہ برقرار ہوجانے کی صورت میں اپنی راہ پالیں گے اور ہمارے ۲۱/۴/۱۹۹۰ء کے خط سے لے کر آپکے ۸ اگست سنہ ۱۹۹۰ء کے آخری خط تک ہونے والے مذاکرات کے نتیجہ کے طور پر آخری حل اور وضاحت کے عنوان سے ہم نے مندرجہ ذیل فیصلے کئے ہیں تاکہ کہیں کوئی بات مبہم نہ رہ جائے۔

۱۔ جنیوا میں ہمارے نمائندہ جناب برزان ابراھیم تکریتی کو آپکے نمائندہ جناب سیروس ناصری کے ذریعہ موصول ہونے والے مؤرخہ ۸ اگست سنہ ۱۹۹۰ء کے جوابی خط میں آپ کی تجویز، سنہ ۱۹۷۵ء کے معاہدہ کو ایک اٹل حقیقت کے طور پر بنیاد قرار دینے اور اس کے ساتھ ہی ہمارے ۳۰ جولائی سنہ ۱۹۹۰ء کے خط میں، خاص طور پر قیدیوں کے تبادلے اور قرار داد نمبر ۵۹۸ کی شق ٦ اور ۷ سے متعلق جو کچھ ذکر ہوا ہے ہم اس سے موافقت کرتے ہیں۔

۲۔ اس تحریر کی بنیاد پر، جو اس خط کی پہلی شق میں اور جو کچھ مؤرخہ ۳۰ جولائی سنہ ۱۹۹۰ء کے خط میں ذکر ہے، ہم ایک وفد تہران بھیجنے کو تیار ہیں یا یہ کہ ایک وفد آپ کی طرف سے بغداد روانہ کیا جائے تاکہ موافقت ناموں کو دستخط کے لئے تیار کرے۔

۳۔ حسن نیت میں پہل کے طور پر ہم روز جمعہ، ۱۷ اگست سنہ ۱۹۹۰ء (۲٦/۵/٦۹) سے اپنی افواج کو آپ کی تمام سرحدوں سے واپس بلا رہے ہیں، اور صرف علامتی فوجوں کو سرحدی محافظ اور پولیس کے عنوان سے باقی چھوڑ رہے ہیں تاکہ طبیعی صورت حال میں وہ اپنی روزمرہ کی ذمہ داریوں پر عمل کریں۔

۴۔ جنگی قیدیوں کو، تمام زیر حراست افراد کے ساتھ ہم فوری طور پر، زمینی سرحدوں کے منجملہ خانقین قصر شیریں اور جو علاقے بھی دونوں طرف سے مورد اتفاق قرار پاتے ہیں، آزاد کریں گے، اور اس سلسلہ میں روز جمعہ، ۱۷ اگست کو سب سے پہلا قدم اٹھا دیں گے۔

برادر علی اکبر ہاشمی رفسنجانی! ہمارے اس فیصلے سے، تمام چیزیں روشن و واضح اور وہ تمام مطالبات اور مسائل جن کو آپنے بنیاد قرار دیا تھا، پورے ہوجاتے ہیں اور اب سوائے اس کے کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا ہے کہ مصالحت نامہ تیار ہو اور دستخط ہوجائے، تاکہ ہم میں سے ہر ایک کے سامنے

ایک نئی اور باعزت زندگی میں قدم رکھنے کی راہ واضح اور آشکار ہے۔

ہمارا باہمی تعاون اسلامی اصول، برابر کے احترام اور ان دشمنوں کو نکال بھگانے کے لئے ہو جو علاقہ میں خلفشار برپا کرنا چاہتے ہیں، جو "گدلے پانی سے مچھلی نکالنے" کا قصد رکھتے ہیں، دوسری زندگی ساز مسائل کے علاوہ اگر ہو سکے تو ہم خلیج کے مسئلہ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں تاکہ خلیج صلح و امن کا سمندر بن جائے اور ہماری بدخواہ غیر ملکی فوجوں اور جنگی بیڑوں سے خالی ہو جائے۔

واللہ اکبر والحمد للہ

صدام حسین ــ صدر جمہوریہ عراق

۲۳ محرم سنہ ۱۴۱۱ھ (۱۵ اگست سنہ ۱۹۹۰ء)

(لائق ذکر یہ ہے کہ صدام حسین نے اپنا یہ خط اقوام متحدہ کے جنرل سیکریٹری کے نام بھی روانہ کر دیا تھا جس کو بعینہ تاریخی سند کے طور پر فائل کر لیا گیا ہے۔ بعد میں ایران کی حکومت نے بھی صدر جمہوریہ ایران کا مذکورہ خط اقوام متحدہ کے دفتر میں سند کے طور پر روانہ کر دیا جس کو وہاں سے فائل کر لیا گیا)

حکومت ایران کا ردعمل

بغداد ریڈیو سے صدام کا خط نشر ہونے کے فوراً بعد ایران کے وزیر خارجہ ڈاکٹر ولایتی نے فرمایا:۔

"یہ اپنی تاریخ میں اسلامی جمہوریہ ایران کی عظیم ترین فتح ہے یعنی جو کچھ ہوا ہے در حقیقت ہمارے عوام کے حق پر مبنی حقوق کی جیت ہے جنھوں نے انصاف یہ ہے کہ آٹھ سال جنگ میں بھرپور پائیداری کا ثبوت دیا ہے۔" ڈاکٹر ولایتی نے فرمایا: "بحمد اللہ آج ایران کے خلاف عراقی حملہ کے دس سال بعد عوام اپنے اس صبر و استقامت اور پائیداری کا پھل دیکھ رہے ہیں، یہ خدا کی مدد سے ملک کی ہمہ جہت تعمیر اور اسلامی جمہوریۂ ایران کے حقوق حقہ کے اثبات کے لئے بہت ہی اچھا سویرا ثابت ہوگا!"

عالمی ردعمل

عالمی ذرائع ابلاغ خصوصاً دنیائے عرب کے اخبارات نے صدام حسین کی جانب سے الجزائر کے معاہدہ ۱۹۷۵ء کی قبولیت کو اپنے پہلے صفحات پر جلی حرفوں میں شائع کرتے ہوئے اس کو اسلامی جمہوریہ

ایران کی عظیم فتح قرار دیا ہے۔ متحدہ عرب امارات کے اخبارات نے صدام کے پیغام پر سخت لب ولہجہ میں تنقید کرتے ہوئے آٹھ سالہ جنگ کو مورد سوال قرار دیا ہے۔

"الاتحاد" کے مطابق: "صدام حسین نے خود ہی ۱۹۸۰ء میں ایران سے جنگ شروع ہونے کے بعد الجزائر کے معاہدہ کو پارہ پارہ کرتے ہوئے اس کو کالعدم قرار دیا تھا اور آج خود ہی اس کو قانونی معاہدہ کے طور پر قبول کر کے درحقیقت ایرانی مطالبات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔"

شارجہ کے اخبار "الخلیج" کے مطابق: "صدام حسین نے ناگہانی طور پر ایرانی مطالبات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور طویل جنگ میں سپر انداختہ ہو گیا۔" اس نے عراق کی جانب سے الجزائر کا معاہدہ قبول کئے جانے کو عراق اور کویت کے واقعات کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ مصری حکومت کو اس واقعہ نے چراغ پا کر دیا اور صدام کے اس عمل کو قاہرہ نے شدت کے ساتھ تنقید کا نشانہ بنایا۔ دبئی سے شائع ہونے والا اخبار "البیان" اس سلسلہ میں لکھتا ہے: قاہرہ ریڈیو نے صدام کے پیغام پر شدید رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "صدام کا پیغام اپنے ذاتی مفادات کے لئے اسلامی ملکوں کو اپنی طرف جذب کرنے کی غرض سے ایک نیا حیلہ ہے۔"

"البیان" کے ہی مطابق: فرانس کے سابق وزیر خارجہ کلود شسون نے صدام کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "اگرچہ ایک لمحہ کے لئے بھی صدام کی باتوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا لیکن صدام نے الجزائر کا معاہدہ قبول کر کے ثابت کر دیا کہ اس نے کویت پر فوجی قبضہ کر کے ایک زبردست بین الاقوامی غلطی کی ہے۔"

اسی طرح کویت اور سعودی عرب کے اخبارات نے اپنے تبصروں پر اعلان کیا کہ: "صدام کی جانب سے ایران کے شرائط کا قبول کیا جانا سرزمین ایران پر عراقی حکومت کے حملہ آور ہونے کی دلیل ہے۔" ان ممالک کے ریڈیو نے عراقی فوج سے درخواست کی کہ ایران کے خلاف آٹھ سالہ جنگ سے عبرت حاصل کریں اور خود کو ایک دوسری جنگ میں گرفتار نہ کریں۔ اسی ضمن میں صدام پر تنقید کرتے ہوئے "الاخبار" لکھتا ہے: "صدام نے الجزائر کے معاہدہ کو لغو قرار دیکر اپنے ملک کو ایران کے ساتھ ایک تباہ کن جنگ میں الجھا دیا اور اس دوران ایک لاکھ ۲۵ ہزار عراقی فوجیوں کو قربان کر دیا اور آخر میں بلا کسی قید و شرط کے ایران کے سامنے سپر انداختہ ہو گیا۔"

لبنانی امل پارٹی کے صدر حسین موسوی (ابو ہشام) نے کہا: "موت کے خطرے سے دوچار

ہو جانے نے صدام کو مجبور کر دیا کہ وہ اسلامی جمہوریہ ایران کے ساتھ ۱۹۷۵ء کے الجزائر معاہدہ کو قبول کر لے۔"

"توحید اسلامی تحریک" کے سربراہ شیخ سعید شعبان نے صدام کی طرف سے الجزائر معاہدہ قبول کئے جانے پر ایرانی عوام اور حکومت کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ ایران و عراق کی مسلمان قوموں کے درمیان عالمی استکبار اور عالمی صہیونزم سے مقابلہ کے لئے آپسی معاہدہ ہونا چاہئے۔ ترکی کے اخبار "حریت" نے "صدام نے مشرقی محاذ پر ہتھیار ڈال دیئے" عنوان کے تحت لکھا ہے کہ "فوجی قبضہ کے تحت جس زمین کے لئے عراق نے ایران سے آٹھ سال جنگ لڑی تھی ایک بیان جاری کر کے غیر متوقع طور پر اسے ایران کے سپرد کر دیا۔"

روزنامہ "گون ایڈین" نے اس کو ایران کے حق میں ایک عظیم امتیاز اور کارنامہ قرار دیا، روزنامہ "ملیت" کے مطابق صدام کے اس اقدام سے علاقائی قوت و طاقت کا توازن الٹ پلٹ ہو کے رہ گیا روزنامہ "بوگون" نے لکھا ہے کہ "اس طرح صدام نے ایک دوسرے پر فوجی حملہ نہ کرنے کے سلسلہ میں شام اور ترکی سے کئے جانے والے معاہدوں کے بعد ایران کے ساتھ بھی برابر کی دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا ہے۔"

مغربی جرمنی کے ریڈیو نے پہلی بار اپنے سیاسی تبصرے میں اعلان کیا: "صدام حسین نے ۱۹۸۰ء میں ۱۹۷۵ء کے الجزائر معاہدہ کو نظر انداز کر کے ایران کے خلاف جنگ شروع کی تھی۔" اور اسی خبر کے مطابق "بدھ کے دن صدام حسین کی طرف سے ایران کے ساتھ صلح کی قبولیت کو سن کر عراقی عوام نے شادمانی کے انداز میں ہوائی فائر کر کے جشن منایا۔"

اٹلی کے وزیر خارجہ نے نامہ نگاروں کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: "ایران و عراق کے درمیان صلح کی تجویز ایسی لگتی ہے کہ موجودہ حالات میں ایک نمائش ہے۔"

روس کی حکومت نے اعلان کیا، اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے فیصلہ کا نافذ ہونا اور ایران عراق کے درمیان روابط برقرار ہونا خلیج فارس کے بحران کے حل میں مؤثر ثابت ہوگا۔"

صدر جمہوریۂ امریکہ نے نامہ نگاروں سے انٹرویو کے دوران کہا: "عراق کا ایران کی تمام شرائط قبول کر لینا میرے لئے تعجب خیز ہے" انہوں نے مزید کہا: میرے لئے موجودہ حالات میں عراق کی

اس موافقت سے علاقہ میں کیا اثرات مرتب ہوں گے کچھ پیشین گوئی کی ممکن نہیں ہے۔" لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ ایران بھی کویت پر عراقی حملہ سے ناراض ہے۔ ایک سوال کے جواب میں مسٹر بوتش نے کہا۔ "کویت پر عراقی حملہ سے متعلق ایرانی پالیسی میں کسی طرح کا تغیر میں نے مشاہدہ نہیں کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا دونوں ممالک کسی مکمل اور آخری مصالحت پر پہنچ گئے ہوں۔"

بوتش نے ایک دوسرے موقع پر اعتراف کیا ہے کہ: "یہ صدام تھا جس نے ایران پر حملہ کیا تھا اور اب کویت کو غارت کر رہا ہے۔"

اسرائیلی وزیر تعمیرات آریل شارون نے کہا: ایران کے تئیں عراقی پالیسی میں یکبارگی تبدیلی نے اسرائیل کے لئے حالات زیادہ خطرناک بنا دیئے ہیں اور موجودہ خطرے سے اسرائیل کی رہائی کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ صدام کو شکست کی منزل تک پہنچانا ہے۔

خلیج فارس باہمی تعاون کمیٹی کے رکن ملکوں کے وزرائے خارجہ نے ایک اجتماعی بیان میں صدام کی طرف سے ایران کو صلح کی پیشکش کرنے پر تعجب کا اظہار کیا ہے، کمیٹی کے سیکریٹری جنرل عبد اللہ بشارت نے کہا کہ: عراق کی طرف سے الجزائر کے معاہدے ۱۹۷۵ء کا قبول کر لیا جانا آٹھ سالہ جنگ اور ان تمام مادی طاقتوں اور ذخیروں کو کھونے کے بعد ایک بڑی سیاسی، روحی اور ثقافتی شکست ہے۔"

کویت کے وزیر خارجہ شیخ صباح نے صدر جمہوریہ ایران سے ملاقات کے دوران کہا: "ہم ایران کی حکومت اور عوام کو اپنے حقوق حقہ کے حصول اور الجزائر کے معاہدہ ۱۹۷۵ء کے مطابق بیان شدہ مسلم زمینوں کی واپسی اور جنگی قیدیوں کی آزادی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں، انہوں نے کہا: جو کچھ آپ کو نصیب ہوا ہے جائز حقوق اور اصول و اخلاق کی پابندی کی تعیین کیا کو ثابت کرتا ہے، شیخ صباح نے ایرانی وزیر خارجہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: "ہم ایران کے خلاف عراق کی تھوپی ہوئی جنگ کے دوران اپنی حکومت کے رویہ پر اظہار افسوس کرتے ہیں، ہمیں اعتراف ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہوا ایک عظیم غلطی تھی، انہوں نے آخر کلام میں کہا: "میرے ایران آنے سے پہلے ہی بین الاقوامی قوانین کے تحت ایران نے جو بنیادی پالیسی اپنا رکھی ہے ہم اس سے زیادہ ایران سے کچھ اور نہیں چاہتے تھے۔"

اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے صدر صدام کے اقدام کو "ایک مثبت اقدام" سے تعبیر کیا ہے البتہ اقوام متحدہ کے دیگر سیاست مداروں کی نظر میں "ایرانی سرحدوں سے عراقی افواج کی واپسی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ صدام حسین بین الاقوامی طور پر تنہا ہو جانے کے باوجود کویت کا عراق میں انضمام باقی رکھنا چاہتا ہے۔"

برطانوی مبصرین نے صدام کی حکمت عملی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ایران سے اپنی فوجیں واپس بلانے کے سلسلہ میں صدام کا پہلا مقصد تو یہ ہے کہ وہ اس طرح دنیا کے انتہا پسند مسلمانوں کی حمایت حاصل کرے گا اس کے علاوہ اس کی ایک طرف سے سرحد محفوظ ہو جائے گی۔"

ان کے خیال میں: "اس طرح امریکہ خلیج فارس کے بحران میں ایران عراق دشمنی سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔"

مشرق وسطیٰ کے سیاسی حالات کے ماہر کرنل "اندریو ڈنکان" کا کہنا ہے کہ: "جمعہ کے دن سے خلیج فارس کا بحران ایک نئے مرحلہ میں داخل ہو گیا ہے اور یہ اس وقت سے شروع ہوا جب عراق نے دنیا کے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ سعودی عرب کے اماکن مقدسہ کی حفاظت کریں۔ ایران سے مصالحت کی پہل میں بھی صدام کا یہی مقصد ہے کہ عرب دنیا خاص طور پر ایران کے انتہا پسند مسلمانوں کو مطمئن کیا جائے اور مغرب کے خلاف جنگ میں ان کی حمایت حاصل کی جائے۔"

ماخوذ از "اطلاعات" روز پنجشنبہ، ۲۴ محرم ۱۴۱۱ھ

و

روزنامہ "جمہوری اسلامی" پنجشنبہ، ۲۴ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ

عرفانی اصطلاحیں

(۸)

استاد شہید مرتضیٰ مطہری
جناب سید ابوجواد

اس سبق میں ہم بعض عرفانی اصطلاحوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں عرفا کی خود اپنی بہت سی اصطلاحیں ہیں۔ ان کی اصطلاحیں سمجھے بغیر ان کے مقاصد کو سمجھنا صرف ناممکن ہی نہیں بلکہ ہو سکتا ہے ان کے مقصد کے خلاف مفہوم سمجھ میں آئے۔ اور یہ عرفان کے خصوصیات میں سے ہے۔

یوں تو ہر علم کی کچھ اپنی مخصوص اصطلاحیں ہوتی ہیں جن سے واقفیت ناگزیر ہے۔ عرف عام کے مفاہیم علمی مقاصد کی وضاحت کے لئے ناکافی ہیں۔ چنانچہ ہر علم میں کچھ مخصوص الفاظ مخصوص معانی کے لئے اہل فن کے درمیان رائج ہو جاتے ہیں اور عرفان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ لیکن عرفان کی مخصوص اصطلاحوں کا سبب صرف مذکورہ دلیل ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ عرفا اپنے مقاصد، طریقت سے ناآشنا افراد سے چھپانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ عرفانی معانی و مفاہیم غیر عارف کے لئے — کم از کم عارفوں کے خیال میں — قابل فہم ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ عرفا دیگر علوم و فنون کے ماہرین کے برخلاف اپنے مقاصد کو چھپانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اسی لئے عرفا کی اصطلاحیں، اصطلاحی پہلو کے ساتھ ہی ساتھ کسی حد تک معمائی پہلو کی بھی حامل ہیں لہٰذا اس معمّہ کا "راز" معلوم کرنا ضروری ہے۔

ان دو وجوہات کے علاوہ ممکن ہے ایک تیسری وجہ بھی کارفرما ہو جو کام کو زیادہ

پیچیدہ بنا دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ بعض عرفا ۔ کم از کم وہ عرفا جو "ملامتی" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں ۔ سیر و سلوک کے مراحل میں "تعنیات" (تشخصات) کو ختم کرنے اور عوام میں فخر و مباہات اور "نام" و نمود پیدا کرنے کے بجائے "ننگ" و عار حاصل کرنے کی خاطر اپنی باتوں میں "ریائے معکوس" کے اظہار کی کوشش کرتے تھے ۔ یعنی ان ریاکاروں کے برعکس جو برے ہیں لیکن اپنے کو اچھا ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو کو گیہوں بنا کر پیش کرتے ہیں، یہ عرفا چاہتے ہیں کہ ان کی اچھائیاں صرف ان کے اور خدا کے درمیان ہی محدود رہیں اور عوام انھیں برا سمجھتے رہیں ۔ وہ اپنے گیہوں کو جو بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس طرح اپنے نفس پر خود نمائی و خود پرستی کی تمام راہیں مسدود کردیں

کہا جاتا ہے کہ خراسان کے اکثر عرفا "ملامتی" تھے، بعضوں کا خیال ہے کہ حافظ بھی ملامتی ہیں "رندی" "لاپرواہی" "قلندری" اور "قلاشی" جیسے مفاہیم کا مقصد صرف خلق سے بے اعتنائی برتنا ہے نہ کہ خالق سے بے توجہی ۔

حافظ نے باطن کے اچھے ہونے اور بدنامی کے اسباب ظاہر کرنے کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں :۔

گر مرید راہ عشقی فکر بدنامی مکن

شیخ صنعان خرقہ ، رھن خانہ خمار داشت

یہ شیخ صنعان کے مشہور قصہ کی طرف اشارہ ہے ۔

★★★

گر من از سرزنش مدعیان اندیشم

شیوہ مستی و رندی نرود از پیشم

زھد رندان نو آموختہ راہی بہ دھی است

من کہ رسوائے جہانم چہ صلاح اندیشم

★★★

بہ می پرستی از آن نقش خود بر آب زدم

کہ تا خراب کنم نقش خود پرستیدن

وقت آن شیرین قلندر خوش کہ در اطوار سیر
ذکر تسبیح ملک در حلقۂ زنار داشت

لیکن حافظ نے ایک دوسرے مقام پر تقدس کی نمائش (ریاکاری) کی طرح فسق کی نمائش (ملامتی پسندی) کی بھی مذمت کی ہے :۔

دلا دلالت خیرت کنم بہ راہ نجات
مکن بہ فسق مباہات و زہد ہم مفروش

مولانا روم ملامتیوں کا دفاع کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

جیبن زبد نامان نباید ننگ داشت
ہوش بر اسرارشان باید گماشت
ای بسا زر کہ سیہ تابش کنند
تا شود ایمن ز تاراج و گزند

جن چیزوں کے عرفا قائل اور فقہا مخالف ہیں ان میں ایک یہی مسئلہ ہے اسلامی فقہ جس طرح سے ریا کی مذمت کرتی ہے اور اسے ایک قسم کا شرک سمجھتی ہے اسی طرح ملامتی پسندی کو بھی ناپسند کرتی ہے، اس کی نظر میں کسی بھی مومن کو اپنی سماجی عزت و آبرو کا دامن داغدار بنانے کا حق نہیں ہے ۔خود بہت سے عرفانے بھی "ملامتی پسندی" کی مذمت کی ہے ۔

مقصد یہ ہے کہ ملامتی پسندی کا شیوہ ـــــ جو بعض عرفا کے یہاں معمول رہا ہے ـــ سبب بنا کہ وہ عمداً اور جان بوجھ کر اپنے انکار اور اہداف و مقاصد کو الٹ کر پیش کرنے لگے اور یہ طریقہ کار ان کے مقاصد سمجھنے کو بہت مشکل بنا دیتا ہے ۔

اہل عرفان کے ایک پیشوا ابو القاسم قشیری، رسالہ قشیریہ میں صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ عرفا عمداً مبہم گوئی سے کام لیتے ہیں کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ناسمجھ افراد ان کے اطوار، حالات اور مقاصد سے باخبر ہوں، کیونکہ یہ چیزیں ناسمجھوں کے فہم و ادراک سے باہر ہیں [1]

---

[1] رسالہ قشیریہ ص ۳۲

عرفا کی اصطلاحیں بہت زیادہ ہیں۔ کچھ اصطلاحیں، نظری عرفان یعنی عرفانی تصورِ کائنات اور اس تعبیر و تفسیر سے تعلق رکھتی ہیں جو عرفان کائنات کے متعلق پیش کرتا ہے۔

یہ اصطلاحیں فلسفیوں کی اصطلاحات جیسی اور وضع کی ہوئی ہیں اور ان کا سمجھنا بھی بہت مشکل ہے جیسے: فیض اقدس، فیض مقدس، وجود منبسط، حق مخلوق بہ، حضرات خمس، مقام احدیت، مقام واحدیت اور مقام غیب الغیوب وغیرہ۔

کچھ اصطلاحیں عملی عرفان یعنی عرفانی سیر و سلوک کے مراحل سے مربوط ہیں چنانچہ فطری طور پر یہ اصطلاحیں انسان سے مربوط اور نفسیاتی یا اخلاقی مفاہیم کے مانند ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک خاص قسم کا نفسیاتی علم ہے اور وہ بھی تجرباتی علم النفس۔ عرفا کے خیال میں فلاسفہ یا نفسیات کے ماہروں یا دینی علماء یا عمرانیات کے ماہروں کو جنھوں نے عملی طور پر اس وادی میں قدم نہیں رکھا ہے اور نفس کے ان حالات و اطوار کا نزدیک سے مشاہدہ و مطالعہ نہیں کیا ہے انھیں بھی ان مسائل میں اظہار رائے کا حق نہیں ہے۔ پھر دوسرے طبقے کس شمار میں آتے ہیں۔

نظری عرفان کی اصطلاحوں کے برخلاف یہ اصطلاحیں قدیمی ہیں۔ کم از کم تیسری صدی یعنی "ذوالنون"، "بایزید" اور "جنید" کے زمانہ سے موجود ہیں۔

اب ہم یہاں قشیری اور دیگر عرفا کی بیان کردہ بعض اصطلاحیں پیش کر رہے ہیں:۔

۱۔ وقت

ہم گزشتہ سبق میں بوعلی سینا کی زبانی یہ اصطلاح نقل کر چکے ہیں۔ اب ہم خود عرفا کا بیان پیش کر رہے ہیں۔ قشیری کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ "وقت" کا مفہوم نسبی و اضافی ہے۔ عارف پر جب کوئی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ ایک خاص عمل کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ خاص حالت اس نقطہ نظر سے کہ ایک مخصوص عمل کا تقاضا کرتی ہے اسے اس عارف کے "وقت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ البتہ ممکن ہے کہ اس حالت میں ایک دوسرا عارف، کوئی دوسرا "وقت" رکھتا ہو یا خود یہی عارف کچھ دوسرے حالات میں دوسرے "وقت" کا مالک ہوگا اور دوسرا وقت دوسرے اعمال و فرائض کا متقاضی ہوگا۔

عارف کو "وقت شناس" ہونا چاہئے۔ یعنی جو حالت غیب سے اس پر طاری ہوئی ہے اور اس حالت میں جو فریضہ اس پر عائد ہوتا ہے اسے پہچانے۔ اسی طرح عارف کو وقت کو غنیمت سمجھنا چاہئے۔ اسی لئے کہا گیا ہے: "عارف ابن الوقت" ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں:

صوفی ابن الوقت باشد اے رفیق

نیست فردا گفتن از شرط طریق

یہ اصطلاحی وقت وہی ہے جسے فارسی کے عرفانی اشعار میں "دم" یا "عیش نقد" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خاص طور سے حافظ نے "نقد عیش" اور "دم کو غنیمت جاننے" کے بارے میں بہت سے شعر کہے ہیں۔

ناآشنا یا بدخواہ افراد نے جو حافظ کے کلام سے اپنے فسق و فجور کی توجیہ کرنا چاہتے ہیں یہ خیال کیا ہے یا یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ حافظ کا مقصد مادی لذت پرستی اور خدا، مستقبل نیز عاقبت کو فراموش کرنے کی دعوت دینا ہے۔ یعنی وہی چیز جسے اہل یورپ "ایپکیورازم"[1] کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

"دم کو غنیمت جاننا" یا "عیش نقد" حافظ کے اشعار کی ایک تکیہ گاہ ہے۔ شاید تیس بار یا اس سے بھی زائد اس مفہوم پر تکیہ کیا گیا ہے۔ ظاہری بات ہے چونکہ حافظ کے اشعار میں، رمزیہ گفتگو یا دوسرے لفظوں میں "امراز" اور سمبولک انداز میں بات کہنے کی عرفانی روش کی بہت زیادہ رعایت ہوئی ہے لہٰذا ان کے بہت سے اشعار سے بظاہر انہی فاسد معانی و مفاہیم کا وہم ہوتا ہے لیکن ہم یہاں ان کی چند بیتیں پیش کر رہے ہیں جو ان کے تمام اشعار کے لئے قرینہ بن سکتی ہیں:

من اگر بادہ خورم ورنہ چہ کارم باکس

حافظ راز خود و عارف "وقت" خویشم

***

خیز تا خرقۂ صوفی بہ خرابات بریم

شطح و طامات بہ بازار خرافات بریم

---

[1] "EPICURISM" یونانی فلسفی ایپکور کا اخلاقی فلسفہ ہے۔ وہ لذت پرستی کو انسان کا اصلی مقصد اور خیر مطلق سمجھتا تھا۔

شرمسار باد ز پشمینہ آلودہ خویش
گر بدین فضل و هنر نام کرامات بریم
قدر "وقت" ار نشناسد دل و کاری نکند
بس خجالت کہ ازاین حاصل اوقات بریم

★★★

سحر گہ رهروی در سرزمینی
همی گفت این معما با قرینی
کہ ای صوفی شراب آنگہ شود صاف
کہ در شیشہ بماند اربعینی[1]
خدا زآن خرقہ بیزار است صد بار
کہ صد بت باشدش در آستینی
نمی بینم نشاط "عیش" در کس
نہ درمان دلی نہ درد دینی
درونہا تیرہ شد باشد کہ از غیب
چراغی برکند خلوت نشینی
نہ حافظ را حضور درس خلوت
نہ دانشمند را علم الیقینی

اس سلسلہ میں حافظ کے ذومعنی اشعار بے شمار ہیں منجملہ یہ شعر:-

در عیش نقد کوش کہ چون آبخور نماند
آدم بہشت روضہ دارالسلام را

---

[1] من اخلص للہ اربعین صباحاً جرت ینابیع الحکمۃ من قلبہ علی لسانہ - حدیث نبوی
جو شخص چالیس دن اپنے دل کو خدا کے لئے خالص بنالے خدا اس کی زبان پر اس کے دل سے حکمت کے چشمے جاری کر دے گا۔

قشیری کہتے ہیں : یہ جو کہا جاتا ہے "صوفی ابن الوقت ہے" یعنی وہ ہمیشہ وہی کام انجام دیتا ہے جو اس کے لئے اس وقت یا اس حال میں اولویت رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے "الوقت سیف قاطع" یعنی وقت کاٹنے والی تلوار ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وقت کا حکم قاطع ہے اس کی مخالفت ، قابل ثابت ہو سکتی ہے۔

۲۔۳ حال و مقام

عرفا کی مشہور اصطلاحوں میں سے ایک حال و مقام کی اصطلاح ہے۔ عارف کے دل پر بے اختیار جو چیز وارد ہو جائے اسے "حال" کہتے ہیں۔ اور جو چیز حاصل کی جاتی ہے اسے "مقام" کہتے ہیں۔ حال، سریع الزوال ہوتا ہے لیکن مقام باقی و پائیدار ہوتا ہے، کہا گیا ہے کہ احوال بجلی کے کوندے کے مانند ہیں جو جلد ہی مٹ جاتی ہے۔

حافظ کہتے ہیں :۔

برقی از منزل لیلیٰ بدرخشید سحر
وہ کہ با خرمن مجنون دل افکار چہ کرد

سعدی کہتے ہیں :۔

یکی پرسید از آن گم گشتہ فرزند
کہ ای روشن روان پیر خردمند
ز مصرش بوی پیراهن شنیدی
چرا در چاه کنعانش ندیدی
بگفتا "حال" ما "برق" جهان است
دمی پیدا و دیگر دم نهان است
گهی بر طارم اعلیٰ نشینم
گهی تا پشت پای خود نبینم
اگر درویش در "حالی" بماندی
سر دست از دو عالم برفشاندی

گزشتہ درسوں میں ہم نے نہج البلاغہ کے یہ جملے نقل کئے تھے:-

قد احيى عقله وامات نفسه، حتى دقّ جليله ولطف غليظه وبرق له لامع كثير البرق.... خطبہ/۲۲۰

مومن نے اپنی عقل کو زندہ رکھا اور اپنے نفس کو مار ڈالا یہاں تک کہ اس کا ڈیل ڈول لاغر اور تن و توش ہلکا ہوگیا۔ اس کے لئے بھرپور درخشندگیوں والا نور ہدایت چمکا۔

عرفا اس کوندنے والی بجلی کو "لوائح" "لوامع" اور "طوالع" سے تعبیر کرتے ہیں البتہ اس فرق و اختلاف کے پیش نظر جو اس کی چمک کے باقی رہنے کی مدت اور اس کی شدت نیز درجات و مراتب میں پایا جاتا ہے۔

۴، ۵۔ قبض اور بسط

عرفا کی نگاہ میں یہ دو کلمے بھی ایک خاص معنی و مفہوم رکھتے ہیں۔ قبض یعنی وہ حالت جب عارف کی روح پژمردہ ہوتی ہے اور بسط یعنی وہ حالت جب روح شگفتہ ہوتی ہے۔ عرفا نے قبض و بسط اور اس کے اسباب و علل کے سلسلہ میں اچھی خاصی بحث کی ہے۔

۶، ۷۔ جمع اور فرق

یہ دو اصطلاحیں بھی عرفا کی عبارتوں میں بہت استعمال ہوتی ہیں قشیری کہتے ہیں، جو چیز بندہ سے تعلق رکھتی ہے، بندہ نے اسے حاصل کیا ہے اور مقام بندگی کے لائق ہے اسے "فرق" کہتے ہیں اور جو چیز خدا کی طرف سے ہے اور جسے خدا نے نازل و القاء کیا ہے اسے "جمع" کہتے ہیں۔ جسے خدا اطاعتوں اور عبادتوں سے آگاہ کردیتا ہے وہ مقام فرق میں ہوتا ہے اور جس پر خدا اپنی عنایتیں نازل کرتا ہے وہ مقام جمع پر فائز ہوتا ہے۔ حافظ کہتے ہیں:-

به گوش هوش نیوش از من و به عشرت کوش
که این سخن سحر از هاتفم به گوش آمد
ز فکر "تفرقه" باز آی تا شوی "مجموع"
به حکم آنکه چو شد اهرمن، سروش آمد

۸، ۹ غیبت و حضور

غیبت یعنی خلق سے بے خبری کی حالت جو کبھی عارف پر طاری ہوتی ہے۔ اس حال میں عارف خود اپنے اور اپنے اطراف سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ عارف چونکہ اس وقت خدا کے حضور میں ہوتا ہے لہٰذا وہ خود اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتا ہے اور اس کی زبان حال یہ ہوتی ہے:

نہ آن چنان بہ تو مشغولم ای بہشتی روی
کہ یاد خویشتنم در ضمیر می آید

ممکن ہے اس حالت میں ــ یعنی جس وقت وہ پروردگار کے حضور میں ہوتا ہے اور خود اپنے اور اپنے اطراف سے بے خبر و غائب ہوتا ہے ــ بہت سے حوادث اس کے سامنے رونما ہوں اور وہ ان سے باخبر نہ ہو سکے۔

عرفا اس سلسلہ میں بہت سے افسانوی قصے نقل کرتے ہیں۔ قشیری لکھتے ہیں، ابو حفص حداد نیشاپوری کا معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ انھوں نے لوہاری کا پیشہ ہی چھوڑ دیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن وہ اپنی دکان میں بیٹھے کام میں مشغول تھے کہ ایک شخص نے قرآن مجید کی کسی آیت کی تلاوت کر دی، اس سے ان کے دل پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ وہ اپنے احساس سے "بے خبر" ہو گئے اور اسی بے توجہی کے عالم میں بھٹی میں ہاتھ ڈال کر آگ سے سرخ لوہا نکال لیا یہ دیکھ کر ان کا شاگرد چیخ پڑا کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ چیخ سن کر ابو حفص کو ہوش آیا اور اس کے بعد انہوں نے یہ پیشہ چھوڑ دیا۔

قشیری ہی لکھتے ہیں: شبلی جب جنید کے پاس آئے تو جنید کی بیوی ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ جنید کی بیوی نے وہاں سے ہٹ جانا چاہا۔ لیکن جنید نے کہا شبلی اس وقت اس حال میں ہیں کہ انھیں تمہاری خبر بھی نہیں ہے، یہیں بیٹھی رہو۔ وہ وہیں بیٹھ گئیں۔ جنید نے تھوڑی دیر شبلی سے گفتگو کی یہاں تک کہ شبلی نے رفتہ رفتہ رونا شروع کر دیا اس وقت جنید نے اپنی بیوی سے کہا اب تم پردہ کر لو کیونکہ شبلی اب ہوش میں آ رہے ہیں۔

حافظ کہتے ہیں:

چو ہر "خبر" کہ شنیدم رہی بہ حیرت داشت
از این سپس من و ساقی و وضع "بے خبری"

حافظ ہی کہتے ہیں :-

حضوری گر ہمی خواہی از او غایب مشو حافظ

متی ما تلق ما تھوی دع الدنیا و اھملھا

اولیاء اللہ پر حالتِ نماز میں طاری ہونے والی حالت کہ وہ اپنے آپ اور اپنے اطراف سے مکمل طور پر غافل ہوجاتے تھے، عرفا اس کی بھی اس "غیبت" کے عنوان سے تفسیر کرتے ہیں۔ لیکن ہم بعد میں یہ بتائیں گے کہ ایک چیز ایسی بھی ہے جو "غیبت" سے بالاتر ہے اور اولیاء اللہ میں جو چیز پائی جاتی تھی وہ وہی چیز ہے۔

۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوق، شرب، ری، سکر

ذوق یعنی "چکھنا" عرفا کا خیال ہے کہ کسی چیز سے علمی واقفیت جاذبیت وکشش نہیں رکھتی۔ شوق وانجذاب چکھنے کی فرع ہے۔ بوعلی سینا، اشارات کی آٹھویں نمط (فصل) میں کسی مناسبت سے اسی بات کو بیان کرتے ہیں اور اس کے لئے عنین (نامرد) کی مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں چونکہ "عنین" جنسی میلان سے محروم ہوتا ہے۔ اس نے اس کا مزہ نہیں چکھا ہے لہٰذا آپ جتنا بھی اس کے سامنے اس کی لذت کا تذکرہ کریں اس میں شوق پیدا نہ ہوگا۔

پس ذوق، لذت کا چکھنا ہے۔ عرفانی ذوق سے مراد تجلیات و مکاشفات سے حاصل ہونے والی لذتوں کا حضوری ادراک ہے۔ شروع شروع کا "چکھنا" "ذوق" ہے اور اس کا جاری رہنا "شرب = پینا" ہے اور مست ہوجانا "سکر" ہے، اس سے لبریز ہوجانا "ری یعنی سیراب ہوجانا" ہے۔

عرفا کا کہنا ہے کہ ذوق سے جو چیز حاصل ہوتی ہے تساکر ہے نہ کہ سکر۔ جو چیز شرب سے حاصل ہوتی ہے اسے سکر کہتے ہیں۔ لیکن لبریز ہوجانے سے جو حالت طاری ہوتی ہے وہ آپے میں آنا یعنی (صحو) ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عرفا کے کلام میں مے اور شراب کا بہت زیادہ تذکرہ ہوا ہے۔

۱۴، ۱۵، ۱۶ محو، محق، صحو

عرفا کے یہاں محو اور صحو کا تذکرہ بھی بہت ہوا ہے۔ محو سے

ان کی مراد یہ ہے کہ عارف اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اپنی ذات کو فنا کرکے ذات حق میں محو ہو جاتا ہے، یعنی اس کی انانیت اور "میں" محو ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے کو دوسروں کی طرح "میں" تصور نہیں کرتا اگر یہ محویت اس حد کو پہنچ جائے کہ "میں" کے آثار بھی مٹ جائیں تو پھر اسے "محق" کہتے ہیں۔

محو اور محق دونوں کا درجہ "غیبت" سے بالاتر ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ محو و محق فنا و نابودی ہیں البتہ یہ ممکن ہے کہ عارف حالت فنا سے حالتِ بقا کی طرف لوٹ آئے لیکن اس کا مطلب پہلی حالت کی طرف تنزل نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی ذات کے ذریعہ بقاء حاصل کرے گا (بقاء باللہ)۔ یہ حالت جو "محو" کی حالت سے مافوق ہے اسے "صحو" کہتے ہیں۔

۱۷۔ خواطر

عرفا، عارف کے دل پر ہونے والے القاآت والہامات کو "واردات" کہتے ہیں، یہ واردات کبھی قبض و بسط یا سرور و حزن کی صورت میں ہوتے ہیں اور کبھی کلام و خطاب کی شکل میں۔ یعنی وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ کوئی ان کے اندر سے ان سے بات کر رہا ہے۔ اس صورت میں ان واردات کو "خواطر" کہا جاتا ہے۔

عرفا نے خواطر کے متعلق خاصی گفتگو کی ہے۔ وہ کہتے ہیں، خواطر کبھی رحمانی ہوتے ہیں، کبھی شیطانی اور کبھی نفسانی۔ خطرہ کی ایک جگہ یہی خاطرات ہیں۔ ممکن ہے انحراف اور لغزش کے نتیجہ میں شیطان انسان پر مسلط ہو جائے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وان الشیاطین لیوحون الی اولیآئھم (انعام/۱۲۱)

بے شک شیاطین اپنے مددگاروں کو وحی کرتے ہیں۔

عرفا کہتے ہیں، فرد اکمل کو ہمیشہ یہ تشخیص دینا چاہئے کہ یہ خاطرہ، رحمانی ہے یا شیطانی بنیادی کسوٹی یہ ہے کہ، دیکھیں وہ خاطرہ کس چیز کا حکم دیتا ہے اور کس چیز سے روکتا ہے۔ اگر اس کا امر و نہی شریعت کے اوامر و نواہی کے خلاف ہو تو وہ یقیناً شیطانی ہے۔

ھل انبئکم علی من تنزّل الشیاطین، تنزل علی کلّ افاک اثیم شعراء/۲۲۲

۱۸، ۱۹، ۲۰۔ قلب، روح، سر

عرفا، انسان کی روح کو کبھی "نفس" سے تعبیر کرتے ہیں کبھی "قلب" سے کبھی روح سے اور کبھی سر سے۔ جب تک انسان کی روح، شہوتوں کی غلام بنی رہتی ہے اسے "نفس" کہتے ہیں، اور جب الٰہی معارف کی منزل بن جاتی ہے تو اسے "قلب" کہتے ہیں۔ جب اس میں محبت الٰہی نمودار ہوتی ہے تو اسے "روح" کہتے ہیں اور جب شہود کے مرحلہ میں داخل ہوجاتی ہے تو اسے "سر" کہتے ہیں۔ البتہ عرفا "سر" سے بھی بلند درجے کے قائل ہیں جیسے "خفی" و "اخفی" کہتے ہیں۔

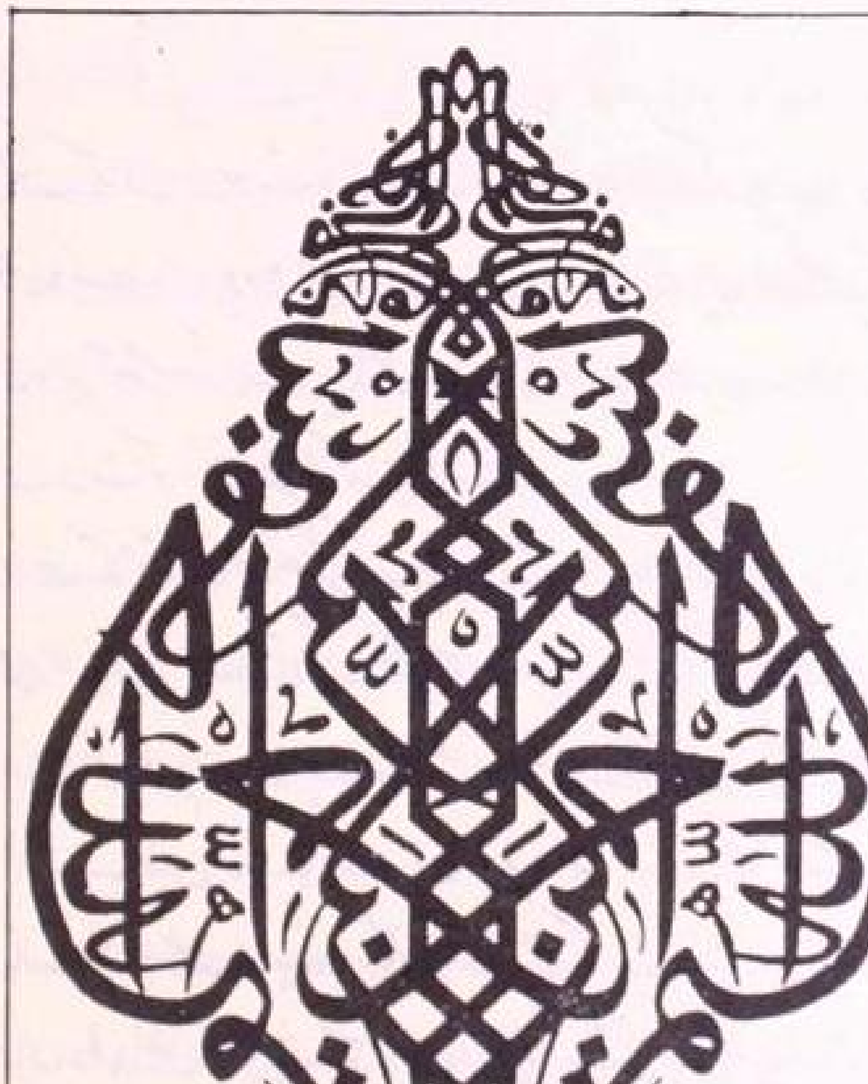

اسلامی تفکر میں فلسفہ کا کردار

جناب شیخ جوادی آملی
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

ہماری بحث قرآن کریم کی ہدایت کے سلسلہ میں تھی کہ خداوند عالم نے اسے تمام انسانوں کے لیے ہدایت قرار دیا ہے اور اس منزل میں دو موضوع سامنے آتے ہیں۔ ایک تعلیمی ہدایت، دوسرے تزکیہ نفس کے ذریعہ ہدایت۔

تعلیمی ہدایت میں بھی یہ بحث درپیش تھی کہ: قرآن جس راہ و روش کی ہدایت کرتا ہے آیا وہ کوئی مخصوص راہ و روش ہے یا اس نے عقلا کی فطرت کو ہی درست قرار دیا ہے؟ اور عقلا کی فطرت بھی یہ ہے کہ وہ بدیہیات کو ایک خاص نظم کے تحت — جسے منطقی نظم کہتے ہیں — ترتیب دیتے ہیں اور نظری نتیجہ تک پہنچتے ہیں۔ گزشتہ بحث و گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کریم اس منطقی طرز تفکر کی تائید کرتا ہے۔ اسی سلسلہ میں منطقی روش پر جو گیارہ اعتراضات کیے گئے تھے ان کے جوابات دیئے جا چکے۔ اب بارھواں اعتراض اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

بارھواں اعتراض

یہ ہے کہ اگر منطقی روش کافی ہے تو قرآن کریم ہدایت کو صاحبان تقویٰ میں ہی منحصر کیوں جانتا ہے۔! "ھدی للمتقین"؟ (بقرہ/۲) اور چونکہ منطقی روش میں عادل و ظالم

مومن و کافر، باتقویٰ اور بے تقویٰ سب برابر ہیں اور تمام افراد تمام علوم میں اس روش سے استفادہ کر سکتے ہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ قرآن کی روش منطقی روش نہیں ہے !! اور واضح عبارت میں یوں کہا جائے کہ : قرآن کریم کی بہت سی آیتیں یہ بتاتی ہیں کہ دینی معارف سے فائدہ اٹھانے والے صرف اہل تقویٰ ہی ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیتیں :-

۱- وما یتذکر الا من ینیب (غافر / ۱۳)

"جو شخص اہل انابت یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہے وہی اللہ کو یاد رکھنے والا ہے"

جبکہ منطقی طرز تفکر میں جو اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جو اس سے انکار کرتے ہیں دونوں یکساں ہیں !

۲- "ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا" (طلاق / ۲)

"وہی شخص شبہات و مشکلات کے تنگنا سے نکل سکتا ہے جو اہل تقویٰ ہو جبکہ منطقی استدلالات میں متقی اور غیر متقی افراد میں کوئی فرق نہیں ہے !

۳- فاعرض عن من تولی عن ذکرنا ولم یرد الا الحیوۃ الدنیا ذلک مبلغہم من العلم (نجم / ۳۰)

ان (دنیا پرست، خدا سے روگرداں افراد) کا علم اسی قدر ہے کہ وہ دنیا کو سمجھیں اور اسی میں لگے رہیں، اس سے زیادہ ان کے بس میں نہیں ہے جبکہ ہم سمجھتے ہیں کہ منطقی روش میں جس شخص نے بھی بدیہیات کو ایک خاص اسلوب سے ترتیب دیا نظری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے چاہے وہ دنیا پرست ہو یا اہل آخرت ! پس جن لوگوں نے یاد خدا سے دوری اختیار کی اور دنیا کے طالب ہوئے قرآن ان کے علم کو قاصر کیوں جانتا ہے ؟

بارھویں اعتراض کا جواب

اس اعتراض کے دو جواب ہیں ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی۔ اور چونکہ تفصیلی جواب ہماری بحث کے دوسرے حصہ یعنی "تزکیہ" سے مربوط ہے۔ لہٰذا ہم اسے اسی حصہ کے لئے

چھوڑتے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ اس کا جائزہ لیں گے۔

اجمالی جواب

اگر قرآن کی ہدایت صرف تقویٰ کے محور پر استوار ہے یعنی اگر قرآن کا سمجھنا اور اسے درک کرنا صرف تقوے پر منحصر ہے اور کافر و غیر متقی اس کی ہدایت کو نہیں سمجھتا تو کفار سے انبیاء کے تمام دلائل و احتجاجات کو بے اثر ہونا چاہیئے؟ اور اس کلیہ کی بنیاد پر کہ ہدایت کے لئے تقویٰ شرط ہے، کسی دلیل و احتجاج کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ بے تقویٰ افراد کی ہدایت کرنا محال ہو جائے گا اور جس کی ہدایت ہی ممکن نہیں ہے اس کے لئے دلیلیں و حجتیں قائم کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا!

اگر یہ کلیہ درست ہو تو قرآن کی ان آیات کے کیا معنی کئے جائیں گے :-

"قل فللہ الحجۃ البالغۃ" (انعام / ۱۴۹)

یعنی اے رسول! آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تک پہنچنے کی دلیل اسی کے لئے خاص ہے

"وتلک حجتنا آتینا ھا ابراھیم علی قومہ" (انعام / ۸۳)

اور یہ ہماری دلیلیں ہیں جو ہم نے ابراہیمؑ کو اپنی قوم پر غالب آنے کے لئے عطا کی ہیں۔

"قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین" (بقرہ / ۱۱۱)

اے رسولؐ آپ کہہ دیں کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ۔

"فقولا لہ قولاً لیناً لعلہ یتذکر او یخشیٰ" (طہ / ۴۴)

تم دونوں جاکر اس سے نرمی سے باتیں کرو، شاید وہ نصیحت مان لے یا ڈر جائے۔

اور اس کے علاوہ بھی بہت سی دوسری آیتیں۔

آخر اس کا مطلب کیا ہے کہ خداوند عالم ایک آیت میں یہ فرماتا ہے کہ اللہ نے انسانوں پر اپنی حجت تمام کر دی ہے اور دوسری آیت میں ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اپنی دلیل لاؤ؟ پس معلوم ہوا کہ تقویٰ اس معنی میں ادراک و فہم کے لئے شرط نہیں ہے۔

ایمان کی شرط عمل ہے نہ کہ علم

یہ بات ان لوگوں کے لئے مشخص ہونی چاہیئے کہ: "عمل شرط ایمان ہے علم نہیں" علم کے

مسئلہ میں تقویٰ کبھی شرط نہیں ہے، لہٰذا ممکن ہے کوئی دانشور ہو لیکن صاحب تقویٰ نہ ہو لیکن اگر متاثر ہونا چاہتا ہے یعنی ایمان لانا چاہتا ہے تو اسے حقیقت کو سمجھنا ہوگا اور جب سمجھ گیا تو اسے قبول کرلے گا اور یہ قبول کرنا اور تسلیم کرلینا ہی ایمان ہے۔

البتہ فہم، انسان کے اختیار سے خارج ہے، یعنی انسان جب کسی بدیہی بات تک پہنچتا ہے تو اسے لامحالہ سمجھے گا، اب یہاں وہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نہیں سمجھا، لیکن جو چیز انسان کے اختیار میں ہے وہ ہے اسے ماننا اور تسلیم کرنا۔ یعنی چاہے وہ اسے مانے اور مطیع ہو جائے یا نہ مانے اور انکار کردے۔ جیسا کہ قرآن میں بھی بیان ہوا ہے:۔

"وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلماً وعلواً" (نمل/۱۴)

انہوں نے اس (معجزۂ الٰہی) کا یقین کرنے کے باوجود ستم گری اور کبر و غرور کی بنا پر اس کا انکار کردیا اور نہیں مانا۔

جس دن ایمان لانا کوئی فائدہ نہ دے گا

البتہ وہ دن بھی آئے گا جب تمام مسائل روشن و آشکار ہو جائیں گے لیکن اس دن لوگ ایمان نہیں لاسکیں گے اور وہ قیامت کا دن ہے۔ قیامت کے روز تمام انسان خدا کی معرفت حاصل کرلیں گے اور اس کی حقانیت کو تسلیم کرلیں گے لیکن ایمان لانے کی گنجائش باقی نہ رہے گی:۔

"يومئذ يوفيهم الله دينهم الحق ويعلمون ان الله هو الحق المبين" (نور/۲۵)

کافر کا سارا ہم و غم قیامت کے دن یہی ہے کہ حق اس کے اوپر روشن و واضح ہو گیا لیکن اب وہ اسے قبول نہیں کرسکتا کیونکہ اب وہ روز تسلیم کرنے اور ایمان لانے کا نہیں ہے۔

یہ روایت حضرت رسولؐ خدا اور حضرت علیؑ دونوں سے منقول ہے کہ: "اليوم عمل بلاحساب وغداً حساب بلا عمل"، یعنی آج روز عمل ہے اور حساب و کتاب نہیں ہے اور کل روز حساب ہے اور کوئی عمل قبول نہیں کیا جائے گا۔ قیامت کے دن انسان کی مثال اس شخص کے جیسی ہے جسے رہبروں نے صراط مستقیم کی نشان دہی کردی کہ غلط راہ

اختیار نہ کرے اور گمراہ نہ ہو اور وہ اپنے باطل خیال کے تحت داہنی یا بائیں طرف چلا جاتا ہے اور اچانک ایک عجیب و غریب درہ میں گر پڑتا ہے اس کے تمام اعضاء و جوارح ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں، جب وہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اسے دوسری راہ سے جانا چاہئے تھا، لیکن اب دیر ہو چکی ہے اور نجات کی کوئی راہ باقی نہیں رہ گئی ہے۔

اسی لئے کافر قیامت کے دن اپنے پروردگار سے درخواست کریں گے کہ انھیں دنیا میں واپس بھیج دے تاکہ نیک اعمال بجالائیں لیکن اب انھیں واپسی کی کوئی راہ نہ ملے گی، کیونکہ ایمان عمل سے اور قیامت میں عمل کی کوئی گنجائش نہ رہے گی۔ البتہ کمزور طبقہ کے افراد جن تک دین کے احکام اور الٰہی حکم نہیں پہنچا ہے قاصر ہونے کی صورت میں اللہ کی رحمت ان کے بھی شامل حال ہوگی، مقصر ہونے کی صورت میں نہیں۔

بنابرایں وہ آیات و روایات جو تقویٰ کو ہدایت کا محور جانتی ہیں ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر تقویٰ نہ ہو تو علم نہیں ہے بلکہ اگر تقویٰ نہ ہوگا تو علم سے کوئی فائدہ نہیں حاصل کیا جاسکے گا۔ پس یہاں "یعلمھم" کی منزل تو ہے لیکن "یزکیھم" کا وجود نہیں۔ انشاء اللہ ہم تزکیہ کی بحث میں اس مطلب کا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

ایک اور اعتراض

تیسرے اعتراض میں یہ بات کہی جا چکی ہے کہ منطقی روش اور فلسفی طرز تفکر اس لئے ہے کہ لوگوں کو کتاب و سنت کی پیروی سے دور کر دے! اور آٹھویں اعتراض میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ ہمارے صالح اسلاف نے اسی کتاب و سنت کی راہ کو اپنایا ہے اور درست نہیں ہے کہ ہم منطقی روش سے استفادہ کریں اور سرے سے منطق و فلسفہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں موجود ہی نہ تھا۔ یہ فلسفی طرز تفکر تو خلفا کے زمانہ میں یونان سے لایا گیا اور ان کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کیا گیا، نتیجتاً یہ مسائل پیش آئے!!

جواب: یہ ہے کہ کیا فلسفہ اور عقلی علوم کو اسلامی طرز تفکر میں کوئی دخل تھا، اور آیا فلسفہ اسلام کی فکری روش میں مددگار ثابت ہوتا تھا یا اس کی راہ میں رکاوٹ بنتا تھا؟

اور جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کیا فلسفہ نے اس مقصد کے لئے اسلام میں اپنے لئے کوئی راہ بھی بنائی یا نہیں۔؟

تفسیر المیزان کی پانچویں جلد کے صفحہ ۲۹۳ پر تاریخی بحث کے عنوان سے ایک تفصیلی بحث درج کی گئی ہے۔ اس میں تحریر ہے کہ: ہمیں اس وقت ان افکار و عقائد کی صحت یا سقم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم یہاں تاریخ کے اجمالی جائزہ کی روشنی میں یہ بحث کر رہے ہیں کہ یہ افکار کہاں سے آئے اور کہاں جاکر تمام ہوئے ہیں۔

قرآن، انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں دخیل ہوا ہے اور اسی اعتبار سے اس نے انسان کے فرائض معین کئے ہیں وہ انفرادی زندگی گزارے یا اجتماعی، شہری ہو یا دیہاتی، صنعت و تجارت سے سروکار رکھنے والا ہو یا ثقافتی مسائل سے مختصر یہ کہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جسے انسان انجام دے اور قرآن نے اس پر نفی یا اثبات کی شکل میں اپنا نظریہ پیش نہ کیا ہو۔

الٰہی میزان

مزید یہ کہ جتنی راہیں اور جتنے بھی مکاتب فکر تھے، ہیں اور ہوں گے، اگر وہ باطل ہیں تو قرآن نے انھیں صراحتاً رد کیا ہے اور اگر حق ہیں تو قرآن نے ان کی تصدیق کی ہے۔ اس اعتبار سے قرآن وہ الٰہی میزان ہے جس پر تمام افکار و نظریات کو تولا جانا چاہئے۔

اسی وجہ سے ہمارے عظیم پیشواؤں نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ جتنی روایات اور حدیثیں نقل ہوئی ہیں، ان کی صحت و سقم کو کتاب خدا کے ذریعہ پرکھیں۔ جو قرآن کے موافق ہو اسے قبول کر لیا جائے اور جو موافق نہ ہو یعنی قرآن کے مخالف ہو وہ باطل ہے اسے الگ کر دینا چاہئے۔

ونزلنا علیك الكتاب تبیاناً لكل شیٔ (نحل/۸۹)

اے پیغمبر ہم نے آپ پر وہ کتاب نازل کی جو ہر شئے کو بیان کرنے والی ہے۔ قرآن ان تمام معارف و حقائق کو بیان کرنے والا ہے جو انسان کی سعادت و خوش بختی میں کسی بھی عنوان سے دخیل ہیں۔ پس کوئی بھی مکتب فکر جو کسی بھی زمانہ اور کسی بھی سرزمین سے متعلق ہو اس الٰہی میزان پر تولا اور پرکھا جانا چاہئے۔ نیز ہر طرح کی نقل شدہ روایت کی جانچ پرکھ قرآن کے ذریعہ

ہونی چاہئے۔

قرآن اور مسلمانوں کا طرز فکر

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ صدر اسلام میں قرآن کریم صرف قرأت و تلاوت کی حد تک ہی محدود رہا اور قرآن کے حقائق بیان کرنے والوں یعنی اہل بیتؑ عصمت و طہارت سے جو فائدہ اٹھایا جانا چاہیئے تھا، نہ اٹھایا گیا۔ اور صرف قرأت کی حد تک ان سے استفادہ کیا جاتا تھا۔

صاحب جواہرؒ اپنی کتاب میں "صلوٰۃ" (نماز) کی بحث کے تحت تحریر فرماتے ہیں:۔

"صدر اسلام میں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ سے مسلمانوں کا سلوک اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ ان سے فقط ایک قاری کے عنوان سے قرأت نقل کی جاتی تھی (وفی قرأۃ علی بن ابی طالب کذا ....) صدر اسلام کے مسلمان قرآن کی تفسیر کو ان کے حقیقی مفسرین سے حاصل کرنے کے بجائے حدیثیں لکھنے اور روایت کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں تھے یا پھر مسئلہ خلافت میں الجھے رہتے تھے یا کبھی فتوحات میں مشغول تھے۔ لہٰذا قرآنی طرز تفکر گم ہو کر رہ گیا تھا۔ وہی بات جو قرآن کریم رسول اکرمؐ کی زبان سے نقل کرتا ہے اس زمانہ میں صادق آتی تھی" یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً (فرقان/۳۰) اے میرے پروردگار میری قوم نے قرآن سے کنارہ گیری اختیار کرلی۔

قرآن سے مسلمانوں کی دوری

جی ہاں! کبھی حضرت رسول اکرمؐ سے یہ سوال نہیں کیا گیا کہ خدا نے آسمان و زمین کو چھ روز میں خلق کیا، اس کا مطلب کیا ہے؟ کبھی آنحضرتؐ سے یہ نہیں پوچھا گیا کہ خدا فرماتا ہے: وجعلناھا رجوماً للشیاطین" (سورۂ ملک/۵) اور ہم نے ان ستاروں کو تیر قرار دیا تاکہ وہ شیطانوں کو رجم کریں۔" اس سے کیا مراد ہے؟ اسی طرح کے ہزاروں دوسرے مشکل مطالب جو قرآن میں پائے جاتے تھے، اور وہ لوگ جو عرب تھے، انھیں دیکھ کر سہل انگاری کے ساتھ گزر جاتے تھے اور کبھی ان سے متعلق سوال نہیں کرتے تھے

جس چیز پر اس زمانہ میں زیادہ زور دیا جاتا تھا، وہ قرآن کی قرأت اور اسے حفظ کرنا تھا نہ کہ اسے سمجھنا اور درک کرنا۔ کبھی ثواب قرأت کا مسئلہ اٹھایا جاتا تھا اور قرآن کا بازار گرم کرنے کے لئے تلاوت کے ثواب کی حدیثیں گڑھی جاتی تھیں، گویا قرآن اس کا محتاج ہے کہ اس کے لئے ثواب جعل کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ: اگر کوئی فلاں سورہ پڑھے تو اس کا اتنا ثواب ہے!!

سیوطی نے اس سلسلہ میں اپنی کتاب "اتقان" میں لکھا ہے: "کچھ لوگوں نے قرآن کے بازار کو رونق بخشنے کے لئے قرأت کے ثواب گڑھنے شروع کر دیئے۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ قرآن نور ہے، نور کو گڑھے جانے کی ضرورت نہیں ہے اگر یہ لوگ قرآن کی حقیقت و واقعیت کا ایک گوشہ بھی سمجھ لئے ہوتے اور دوسروں کو سمجھاتے اور وضاحت کرتے تو اس بات کی ضرورت ہی نہ تھی کہ کہا جائے: اگر کسی نے یہ سورہ پڑھا تو یہ اولین و آخرین کا ثواب رکھتا ہے!!"

البتہ تلاوت و قرأت کے ثواب کو بیان کرنے والی معتبر اور صحیح روایتیں کافی تعداد میں موجود ہیں اور اس طرح کی روایتوں کو جعل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن افسوس کہ صدر اسلام میں مسلمانوں کے سوچنے سمجھنے کی سطح ہی اس حد کو پہنچ چکی تھی۔

کتاب "الدر المنثور فی التفسیر بالماثور" جو قرآن کریم کی روائی تفسیر ہے اگرچہ اس میں سترہ ہزار سے زیادہ حدیثیں بیان ہوئی ہیں لیکن شاید اس میں حضرت علیؑ سے مروی ایک سو سے زیادہ حدیثیں نہ ہوں۔ اور مجموعی طور پر تمام اہل بیت عصمتؑ سے روایت شدہ کل دو سو سے زیادہ حدیثیں موجود نہیں ہیں!

شیخ صدوق ابن بابویہ اپنی کتاب "توحید" میں نقل کرتے ہیں کہ ایک علمی محفل میں نافع بن ازرق، حجت خدا حضرت حسین بن علیؑ کی موجودگی میں ابن عباس سے کوئی بات دریافت کرتا ہے۔ ابن عباس اسے امام حسینؑ کی جانب متوجہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں، اسے حضرت حسین ابن علیؑ سے دریافت کرو۔!

قرآن کریم کے بارے میں مسلمانوں کا یہ طرز تفکر تھا جو قرأت و تلاوت یا آیات کے حفظ کرنے تک ہی محدود تھا، ورنہ آپ یہ معما حل نہیں کرسکتے کہ آخر کیوں کبھی ایسا نہ ہوا کہ اصحاب نے

پیغمبر اکرمؐ سے پوچھا ہو کہ آیت: انّا عرضنا الامانۃ علی السّموات والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان.... (احزاب/۷۲) کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ امانت کیا ہے جسے آسمان، زمین، پہاڑ اٹھانے سے معذور ہیں اور انسان نے اس کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا؟!

قرآن، پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں

بہرحال پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں قرآن سے استفادہ کی بحث صرف یتلوا علیھم (یعنی پیغمبرؐ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرتے ہیں) تک محدود تھی، اور بہت تھوڑے لوگ تھے جو تلاوت سے تعلیم و تربیت کی طرف بڑھتے اور مائل ہوتے تھے۔ اور اگر کبھی مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کلامی مجادلوں و مناظروں کی نوبت آتی تھی تو بحث زیادہ طول نہیں کھینچتی تھی، کیونکہ مسلمانوں کی طرف سے مباہلہ کی دعوت دے دی جاتی تھی اور وہ لوگ بھی پیچھے ہٹ جاتے تھے۔

اور اگرچہ قرآن نے شاعری کی کوئی مدح نہیں کی اور سنن و احادیث میں بھی اس کی کوئی خاص تعریف نہیں ہوئی ہے، اس کے باوجود اشعار کا بازار گرم تھا، جاہلی رسوم رائج تھے اور اشعار خوب یاد کئے جاتے تھے۔

پیغمبر اکرمؐ کی کوشش یہ ہوا کرتی تھی کہ اوقات خیال بافی و خیال آفرینی میں صرف نہ ہوں، لہٰذا کہیں بھی اور کسی وقت بھی جہاں لوگ جمع ہوتے تھے، آپؐ انھیں شعر پڑھنے سے منع فرماتے تھے، چاہے کراہت ہی کی حد تک ہو مثلاً فرماتے تھے کہ: جمعہ کے روز شعر نہ پڑھو، جب مسجد میں اکٹھا ہوتے ہو تو اشعار لحن سے پڑھنا اور انکی تکرار کرنا مکروہ ہے وغیرہ، اور دوسری طرف قرآن کی ہی لفظوں میں فرماتے تھے، جہاں تک ہو سکے قرآن پڑھو "فاقرؤا ما تیسّر من القرآن" (مزمل/۲۰) لیکن افسوس ان سے جہاں تک ہو سکا انہوں نے شعر پڑھا اور قرآن کو اپنی زندگی سے الگ کر دیا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اپنے اشعار کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ انھیں سند کے ساتھ نقل کرتے تھے۔ ابو الفرج اصفہانی نے اپنی بیس جلدی کتاب "آغانی" میں شعرائے جاہلی کے

حتیٰ ہجویہ اشعار اور ان کے راویوں کو پوری اسناد کے ساتھ یوں ہی نقل کیا ہے جیسے شیخ کلینی رح نے کتاب کافی میں روایات کو ان کی اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔

یہ لغو اشعار اور خیال بندیوں سے لوگوں کا گہرا لگاؤ اور اندھا عشق تھا جس کی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ ان کو خاص طور سے جب لوگ مقدس مقامات اور محترم ایام میں جمع ہوتے تھے ایسے اشعار پڑھنے منع فرماتے تھے، ورنہ حکمت آمیز اشعار سے آنحضرتؐ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ خود پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں: "وانّ من الشعر لحکماً"[1] لیکن ظاہری بات ہے کہ ایسا شعر عمومی معاشروں میں جاذبیت نہیں رکھتا، جو شعر خیال بندی کا مرقع ہے مدح و قدح کا نمونہ ہے اور اس میں تشبیہ و تشبیب اور استعارہ وکنایہ وغیرہ کا امتزاج پایا جاتا ہے لوگ بالعموم اس کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا پیغمبر اکرمؐ مسلمانوں سے یہ چاہتے تھے کہ اجتماع میں یا کسی موقع پر اکٹھا ہونے کے وقت قرآن کی تلاوت کریں۔

اس طرح آنحضرتؐ لوگوں کے پراگندہ خیالات و جذبات پر روک لگا کر عقل کی راہ باز کرتے ہیں، اسی وجہ سے لوگوں کو قرآن پڑھنے اور قرآن سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں اور اس کے لئے انہوں نے کوئی حد بھی معین نہیں کی ہے۔ "جس قدر تم سے ہو سکے قرآن پڑھو"۔

جس زمانہ میں آنحضرت مدینہ میں تشریف رکھتے تھے۔ جب اسلام کو کوئی خطرہ درپیش ہوتا تھا، سب کو محاذ جنگ پر جانے کا حکم دیتے تھے لیکن علمی میدانوں میں آمادگی کے سلسلہ میں لوگوں سے یہ چاہتے تھے کہ اپنے کاموں کو تقسیم کرلیں۔

"فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقہوا فی الدین (برائت/۱۲۲)

(ہر گروہ سے کچھ لوگ رسول خداؐ کی خدمت میں علم دین حاصل کرنے کے لئے کیوں نہیں جاتے) اور جس وقت خطرہ بہت نزدیک ہوتا تھا تو فرماتے تھے: انفروا جمیعًا (نساء/۷۱) یعنی سب لوگ (محاذ جنگ کی طرف) جاؤ، لیکن جب خطرہ زیادہ محسوس نہیں ہوتا تو فرماتے کیا اچھا ہوتا اگر تم میں سے ایک گروہ تفقہ اور دین حاصل کرنے کے لئے نکلے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۹، ص ۲۹۰

قرآن، رحلت پیغمبرؐ کے بعد

پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد چونکہ حدیث کا بازار گرم تھا لہذا پیغمبرؐ کی صحابیت ایک خاص تقدس کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، مثال کے طور پر اگر صرف اتنا معلوم ہو جاتا کہ فلاں شخص چند روز پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں رہا ہے تو اس سے حدیث بیان کرنے کی درخواست کے لئے اسی کو کافی سمجھا جاتا تھا، اور اگر اس شخص کا ایمان قوی نہ ہوتا اور وہ خود ایک شخصیت بننے کے لئے میدان ہموار دیکھتا تو حدیث جعل کرنا اور گڑھنا شروع کر دیتا تھا۔ اور وہ جو کچھ بھی کہتا، سیدھے سادے لوگ اسے تسلیم کر لیتے تھے اور پھر اس حدیث کو کتاب خدا کی میزان پر پرکھنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ تمام فکریں اور عقلیں حدیثیں یاد کرنے میں لگ گئی تھیں، تفقہ اور دین کی شناخت کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

رفتہ رفتہ بازار حدیث میں اس قدر گرمی آگئی کہ اب کتاب خدا سے صرف پڑھنے اور یاد کرنے کی حد تک استفادہ ہوتا تھا اور کبھی حدیث کو قرآن سے نہیں پرکھتے تھے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں آیت: "یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً" (فرقان/۳۰) (پالنے والے میری امت نے قرآن کو تنہا چھوڑ دیا) رسول اکرمؐ کی زبان مبارک سے ایک روشن حقیقت بن کر ظاہر ہوتی ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے ان حدیث گڑھنے والوں کے سلسلہ میں پیشین گوئی کر دی تھی اور لوگوں کو ان کی پیروی کرنے اور ان کی باتوں پر کان دھرنے سے منع فرمایا تھا۔ یہاں تک کہ آپ فرماتے ہیں: "من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار[1]" جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی (حدیث کی) نسبت دے گا اس کی نشست گاہ آتش جہنم سے پر ہو گی

ائمہ معصومین علیہم السلام نے بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی کسی حدیث کو ہماری طرف نسبت دے تو اسے قرآن کے اوپر پرکھو اگر قرآن کے مطابق نکلے تو قبول کر لو اور اگر مخالف ہو تو اسے دیوار پر دے مارو، کیونکہ قرآن، الٰہی میزان ہے، اور یہ میزان تحریف سے محفوظ ہے۔

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص۴۷۳

قرآن، جعل نہیں کیا جاسکتا

یہ جو قرآن، میزان قرار پایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف وہ تحریف نہیں ہوا ہے بلکہ وہ اصلاً گڑھا نہیں جاسکتا اور تحریف نہیں ہوسکتا۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: "ما کان حدیثاً یفتریٰ" (یوسف/۱۱۱) (یہ قرآن ایسا کلام نہیں ہے جسے گڑھ لیا جائے) اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: "وما کان ھذا القرآن ان یفتریٰ من دون اللہ (یونس/۳۷) (اور یہ قرآن ایسی کتاب نہیں ہے جسے اللہ کے علاوہ کسی اور نے گڑھ لیا ہو) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہرگز افترا اور جعل نہیں ہوسکتا۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ دوسروں نے اس میں تحریف کرنا نہیں چاہا اور اس کو محترم شمار کرتے تھے، بلکہ دراصل یہ کام دشمنان اسلام کے بس کا ہی نہیں ہے، اور یہ آیت مذکورہ بالا آیت سے الگ ہے جس میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: "ہم غیب سے قرآن کی حفاظت کرتے ہیں اور اسے تحریف سے محفوظ رکھتے ہیں: لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ (فصلت/۴۲) (قرآن کے اندر باطل نہ سامنے سے نفوذ کرسکتا ہے اور نہ پس پشت سے) انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (حجر/۹) بلاشبہ ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں)

قرآن و اہل بیت

لیکن حدیث کے سلسلہ میں ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا لوگوں نے جہاں تک چاہا احادیث پیغمبر اکرمؐ کو اپنی مرضی کے مطابق گڑھا اور اسرائیلیات کو اس میں داخل کیا۔ ایسے حالات میں ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ لوگ قرآن ناطق یعنی ائمہ معصومین علیہم السلام کی خدمت میں آکر احادیث کے صحیح یا غیر صحیح ہونے سے متعلق دریافت کرتے لیکن افسوس کہ اس کے بجائے انہوں نے حسبنا کتاب اللہ (یعنی ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے!) کہا جب اس کتاب کے لئے شارح و مفسر ضروری ہے۔ لیکن انہوں نے حقیقی مفسرین کو چھوڑ دیا نتیجہ میں قرآن سے بھی دور ہوگئے۔

اور بعض وہ لوگ بھی جو در اہل بیتؑ پر تو آئے لیکن انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ ان لوگوں نے بھی غلط راہ اختیار کی کیونکہ قرآن و اہل بیتؑ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ پیغمبر اکرمؐ ایک روایت میں جسے عامہ و خاصہ دونوں نقل کرتے ہیں ارشاد فرماتے ہیں: "انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی، ما ان تمسّکتم بھما لن تضلّوا بعدی ابداً" "میں تمہارے درمیان دو سنگین و گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں، کتاب خدا اور میری عترت جو میرے اہل بیت ہیں۔ اگر ان دونوں سے متمسک ہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔

لہٰذا دونوں کو باہم معیار و میزان ہونا چاہئے۔ نہ یہ کہ کوئی شخص قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرے اور اہل بیتؑ سے کوئی سوال نہ کرے، اور نہ یہ کہ معصومؑ کی کوئی روایت چاہے کہیں سے بھی ہو حاصل کرے اور اسے کتاب خدا پر نہ پرکھے جس کا دعویٰ ہے کہ "اس میں کوئی باطل سامنے سے یا پس پشت سے نفوذ نہیں کر سکتا"۔ البتہ اگر کسی روایت کی سند صحیح تھی اور ہم نے اسے قرآن سے مطابقت کر کے بھی دیکھ لیا کہ ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا تو بلا شبہ ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے، کیونکہ جو کچھ معصومؑ کہتا ہے حق ہے، اس لئے کہ معصومؑ قرآن ناطق ہے۔

بہر حال قرآن کریم، پیغمبر اکرمؐ کے بعد مہجور ہو گیا مسلمان یا فتوحات میں لگ گئے یا بعض لوگ راوی کے عنوان سے خود کو پیش کرنے لگے مختصر یہ کہ قرآن کی اہمیت صرف اتنی رہ گئی تھی کہ حفظ و تلاوت کے علاوہ اس سے کوئی استفادہ نہیں کیا جاتا تھا۔

قرآن بنی امیہ کے زمانہ میں

جس وقت معاویہ تخت حکومت پر آیا، خلافت، سلطنت میں تبدیل ہو گئی۔ معاویہ نے بھی، جو اسلام کا دیرینہ دشمن تھا۔ طے کیا کہ عہد جاہلیت کا تمدن رائج کر کے لوگوں کو رفتہ رفتہ قرآن سے دور کر دے۔

مورخین نے لکھا ہے کہ امام حسنؑ کی غم انگیز صلح کے بعد ایک روز معاویہ دعا یا سے سلام لینے کے لئے دربار میں بیٹھا تھا کہ عمرو عاص وارد ہوا اور اس نے کہا: السلام علیك ایھا الملك! (اے بادشاہ آپ پر سلام ہو) اس نے بھی مسکرا کر سلام کا جواب دیا اور اپنے اس تبسم سے یہ

ظاہر کر دیا کہ خلافت و امامت، سلطنت میں تبدیل ہو چکی ہے۔

اس کے بعد قومیت کا مسئلہ پیش آیا۔ معاویہ نے عرب اور غیر عرب کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور لوگوں کو عہد جاہلیت کے امتیازات و افتخارات کی طرف مائل کرنے لگا۔ اس کی سیرت روم کے قیصروں کی سیرت بن گئی تھی۔ لوگوں کو قرآن سے دور رکھنے کے لئے اس کے پاس یہی ایک راہ تھی کہ زمانہ جاہلیت کی رسموں کو زیادہ سے زیادہ رواج دے۔

جو شخص بھی شعر کہتا تھا، بڑے بڑے انعامات پاتا تھا اور جسے شعر گوئی کا سلیقہ نہیں ہوتا تھا، کم از کم عہد جاہلیت کے اشعار پڑھ کر ہی خود کو بارگاہ سلطنت سے نزدیک کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یزید کے شراب سے متعلق اشعار سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ زیاد کا "خطبہ تبراء" لوگوں کی زبانوں پر رہا کرتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ قرآنی آیات فراموشی کا شکار ہوتی چلی گئیں۔

جی ہاں! اگر اولین دور کے مسلمان خمریات یاد کرنے اور جاہلیت کی رسمیں اپنانے کے بجائے اسلام کے دقیق و عمیق مسائل کو علیؑ و آل علیؑ کی درس گاہ سے دریافت کرتے تو پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد ارتداد کی نوبت ہرگز نہ آتی کہ امام صادقؑ جیسی شخصیت کو کہنا پڑا: ارتدّ النّاس بعد رسول اللہ الاّ ثلاث او اربع" (پیغمبر اسلامؐ کے بعد تین یا چار افراد کے علاوہ اکثر لوگ مرتد ہو گئے) ان لوگوں نے نہ صرف قرآن سے دوری اختیار کر لی بلکہ قرآن ناطق (علی علیہ السلام) سے بھی دور ہو گئے۔

قرآنِ ناطق

امیرالمومنین علیہ السلام نہج البلاغہ کے خطبہ / ۱۵۸ (اردو ترجمہ خطبہ / ۱۵۶) میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"۔۔۔۔ فجاءھم بتصدیق الّذی بین یدیہ والنّور المقتدیٰ بہ ذالک القرآن فاستنطقوہ ولن ینطق ولکن اخبرکم عنہ: الا ان فیہ علم ما یاتی والحدیث عن الماضی ودواء دائکم ونظم ما بینکم" (نہج البلاغہ صبحی صالحی خطبہ ۱۵۸ ص ۲۲۳)

یہ قرآن ہے جس نے گزشتہ انبیاءؑ کی کتابوں کی تصدیق کی ہے۔ یہ وہ نور ہے جس سے زندگی کی تاریک راہوں میں فائدہ اٹھانا چاہیے۔ پس تمہیں چاہیئے کہ اس سے ہم کلام ہونے کی فرمائش کرو لیکن وہ تم سے ہرگز کلام نہیں کرے گا بلکہ میں اس سے متعلق تمہیں خبر دیتا ہوں اور تمہیں بتاتا ہوں کہ ماضی و مستقبل کے حالات و واقعات، تمہارے دکھوں کی دوا، اور تمہارے امور حیات کے نظم و ضبط کا نسخہ قرآن میں موجود ہے۔

یہ قرآن ہے جو انسان کو جہالت کے مرض سے نجات دیتا ہے۔ یہ قرآن ہے جو اخلاقی رذالتوں اور گمراہیوں کا مداوا کرتا ہے۔ یہ قرآن ہے جو معاشرہ کی زندگی کو نظم و ضبط عطا کر کے لیے ہرج و مرج سے نجات عطا کرتا ہے۔ لیکن جو شخص قرآن کو تکلم عطا کرتا ہے علیؑ اور ائمہ معصومینؑ ہیں کہ ان کی حیات علم کی حیات ہے اور دراصل علم ان کے وجود کے پرتو میں زندہ ہے: "انا لامراء الکلام فینا تنشبت عروقه وعلینا تهدلت غصونه" ہم کلام کے فرمانروا ہیں۔ اس کی جڑیں ہم سے ہیں۔ اور اس کی شاخیں ہماری طرف جھکی ہوئی ہیں پس ہماری طرف رجوع کرو۔

دینی درس گاہوں میں قرآن کی تدریس

بہر حال قرآن و اہل بیتؑ سے باہم اور ایک ساتھ استفادہ کرنا چاہیئے، نہ صرف قرآن کا پڑھنا ہمیں فائدہ پہنچاتا ہے اور نہ تنہا روایت ہی قرآن کی میزان پر پرکھے بغیر قابل قبول ہے۔

لہٰذا ہم اعلان کرتے ہیں کہ دینی درسگاہوں کے نظام تعلیم پر نظر ثانی کی جائے۔ یعنی تفسیر قرآن کو دینی مدارس کے اصولی و اساسی نصاب میں شامل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس وقت حوزہ میں صرف فقہ و اصول کی تعلیم دی جاتی ہے اور حدیث سے استفادہ کیا جاتا ہے لیکن قرآن بہت کم سامنے آتا ہے۔ ادبی و مقدماتی کتابیں جو دینی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی ہیں (نحو، صرف، بدیع، بیان، عروض وغیرہ) قرآن سے کوئی سروکار نہیں رکھتیں۔ جہاں بھی مثالیں پیش کی جاتی ہیں اشعار جاہلی سے استفادہ کیا جاتا ہے! البتہ بحمد اللہ ادھر کچھ کوششیں ہوئی ہیں کہ اشعار جاہلی سے استفادہ کے بجائے قرآن اور نہج البلاغہ سے استفادہ کیا گیا ہے خدا کرے یہ روش عام ہو جائے۔

منطق کا نہج ایسا نہیں ہے جو قرآن کی آیات سے مثال پیش کرے، بلکہ وہ طرز تفکر کے بارے میں بحث کرتی ہے۔ اصول میں کوئی مسئلہ قرآن سے ربط نہیں رکھتا، اور اگر دو ایک جگہ قرآن سے

استفادہ ہوا بھی ہے تو زیادہ تر اس لیے ہے کہ مثال کے طور پر خبر واحد کی حجیت کی نفی کرے! اس کے علاوہ پورا علم اصول عقلی بنیادوں اور الفاظ کی بحثوں پر انحصار کرتا ہے۔

اب رہی ہماری فقہ تو اس کا دارومدار روایت پر ہے اور کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کے لئے کہا جائے کہ یہ مسئلہ روایت میں موجود نہیں ہے اور صرف قرآن میں ذکر ہوا! چنانچہ اگر کوئی شخص حوزہ میں قرآن پڑھتا ہے اور یقیناً لوگ پڑھتے ہیں۔ تو صرف ثواب کی نیت سے پڑھتے ہیں۔ خود حوزہ کا نہج قرآنی نہیں ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس الٰہی میزان سے معصومینؑ کی روایات کے ساتھ ساتھ استفادہ کیا جائے تا کہ خدانخواستہ کہیں ہم بھی پیغمبر اسلامؐ کے اس شکوہ میں شامل نہ کر لئے جائیں: یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا" (اے میرے پروردگار میری امت نے قرآن کو تنہا چھوڑ دیا)

نتیجہ

مختصر یہ کہ ایک طرف تو قرآن زندگی کے تمام پہلوؤں میں ایک میزان کی حیثیت رکھتا ہے اور دنیا میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جس سے متعلق قرآن نفی یا اثبات کی شکل میں اپنا نظریہ پیش نہیں کرتا، دوسری طرف صدر اسلام کے مسلمان مشکلات یا فکری جمود میں مبتلا تھے، یا فتوحات میں سرگرم تھے یا مسئلہ خلافت میں سرگرداں نظر آتے تھے اور یا پھر حدیثیں حفظ کرنے اور انہیں روایت کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مشغول تھے۔ اور افسوس جب حدیث کے سلسلہ میں باہمی تفاخر اور تشیخیوں کا بازار گرم تھا تو نو مسلم یہودیوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حدیث میں اسرائیلیات داخل کر دیئے اور ہر طرح کی خرافات کو اسلام سے منسوب کر ڈالا۔ شاید وہ بنیادی طور پر اسی لئے اسلام لائے تھے کہ ان خرافات اور انبیا کرامؑ سے متعلق جھوٹی باتوں کو اسلام میں داخل کر دیں۔

اور جب بنی امیہ برسر کار آئے تو چونکہ وہ قرآن سے دیرینہ دشمنی رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے زمانہ جاہلیت کی رسموں کو دوبارہ رواج دے کر مسلمانوں سے قرآن کو بالکل دور کر دیا، بنی عباس نے بھی اس غرض سے کہ قرآن پہچانا نہ جائے اور لوگ اس کے حقائق سے واقف نہ ہونے پائیں معصومینؑ کے گھر کے دروازوں کو لوگوں کے لئے بند کر دیا، کیونکہ یہ حضرات خود قرآن ناطق تھے۔

آج جبکہ خداوند عالم کے لطف و کرم سے وہ دیواریں گر چکی ہیں اور وہ پردے اٹھ چکے ہیں اور نورانیت و حقانیت ظاہر ہونے لگی ہے، ہمیں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ اس لازوال الٰہی سرچشمہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور اس اسلامی انقلاب کی برکت سے جہاں تک ہو سکے قرآن سے ارتباط رکھیں اور قرآن اور اقوال معصومینؑ کو زندہ کرتے ہوئے (جو بذات خود زندہ و پائندہ ہیں) جہالت کے پردوں کو چاک کریں اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتے جائیں۔ ان شاء اللہ

ایسی صورت میں فلسفہ اسلام میں کب داخل ہوا؟ اور اس طرز تفکر نے اسلامی فکر کو نقصان پہنچایا یا نہیں، ہم اسے ان شاء اللہ آئندہ واضح کریں گے۔

نہج البلاغۃ کے سیاسی تعلیمات

حکومت اور عوام کے ایک دوسرے پر حقوق

جناب شیخ محمد تقی رہبر

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

اگرچہ حکومت اور عوام کے ایک دوسرے پر عائد ہونے والے حقوق کو ایک مختصر سی بحث میں بیان نہیں کیا جاسکتا، اور اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لئے تفصیلی بحث اور کافی وقت درکار ہے، لیکن اس بحث میں اپنے شیوہ کے پیش نظر ہم اس موضوع سے متعلق علی علیہ السلام کے کلام کے کچھ اقتباسات ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہ یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ اس کے قبل اور بعد کی بحثوں میں بھی ان باہمی حقوق سے متعلق بہت سی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں جو دوسرے عناوین و موضوعات کے ذیل میں ذکر ہوئی ہیں۔ اب امام علیہ السلام کے بیانات کے کچھ حصے ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ امام نے ایک نسبتاً طویل خطبہ صفین میں ارشاد فرمایا، اس میں حکام اور عوام کے باہمی حقوق کے ذیل میں اس حق شناسی کے آثار اور ان کی قانونی و سیاسی پابندی کے سلسلہ میں کچھ باتیں بیان فرمائیں، جس کا ایک حصہ یوں ہے:۔

«ثُمَّ جَعَلَ ـ سُبحانَه ـ مِنْ حُقُوقِهِ حُقوقاً افْتَرَضَها لِبَعْضِ النّاسِ علىٰ بَعْضٍ، فَجَعَلَها تَتَكافَأُ فِي وُجُوهِها، وَ يُوجِبُ بَعْضُها بَعْضاً، وَلَا يُسْتَوجَبُ بَعْضُها إلّا بِبَعْضٍ. وَأَعْظَمُ ما افْتَرَضَ ـ سُبحانَه ـ مِن تِلْكَ الحُقُوقِ حَقُّ الوالِي عَلَى الرَّعِيَّةِ، وَحَقُّ الرَّعِيَّةِ عَلَى الوالِي، وَفَرِيضَةٌ فَرَضَها اللهُ ـ سُبحانَه ـ لِكُلٍّ عَلىٰ كُلٍّ،

فَجَعَلَها نِظاماً لِاُلْفَتِهِمْ وعِزّاً لِدِينِهِم، فَلَيْسَتْ تَصْلُحُ الرَّعِيَّةُ اِلّابِصَلاحِ الْوُلاةِ، ولاتَصْلُحُ الْوُلاةُ اِلّا بِاسْتِقامَةِ الرَّعِيَّةِ، فَاِذا اَدَّتِ الرَّعِيَّةُ اِلَى الْوالِي حَقَّهُ، وَاَدَّى الْوالِي اِلَيْها حَقَّها عَزَّالْحَقُّ بَيْنَهُم، وقامَتْ مَناهِجُ الدِّينِ، وَاعْتَدَلَتْ مَعالِمُ الْعَدْلِ، وجَرَتْ على اَذْلالِها السُّنَنُ فَصَلَحَ بِذٰلِكَ الزَّمانُ، وطَمِعَ فِي بَقاءِ الدَّوْلَةِ، ويَئِسَتْ مَطامِعُ الْاَعْداءِ. واِذا غَلَبَتِ الرَّعِيَّةُ وَالِيَها، اَوْ اَجْحَفَ الْوالِي بِرَعِيَّتِهِ، اخْتَلَفَتْ هُنالِكَ الْكَلِمَةُ، وظَهَرَتْ مَعالِمُ الْجَوْرِ، وكَثُرَ الْاِدْغالُ فِي الدِّينِ، وتُرِكَتْ مَحاجُّ السُّنَنِ فَعُمِلَ بِالْهَوىٰ، وعُطِّلَتِ الْاَحْكامُ، وكَثُرَتْ عِلَلُ النُّفُوسِ، فَلايُسْتَوْحَشُ لِعَظِيمِ حَقٍّ عُطِّلَ، ولالِعَظِيمِ باطِلٍ فُعِلَ فَهُنالِكَ تَذِلُّ الْاَبْرارُ وتَعِزُّ الْاَشْرارُ وتَعْظُمُ تَبِعاتُ اللّٰهِ ـ سُبْحانَهُ ـ عِنْدَ الْعِبادِ.»

"۔۔۔۔ پھر خداوند عالم نے اپنے ہی حقوق میں سے ان حقوق کو بھی قرار دیا جو بعض افراد بعض پر رکھتے ہیں، پھر ان حقوق کو برابر قرار دیا کہ ہر ایک حق دوسرے حق کا باعث ہوتا ہے۔ یہ حقوق یک طرفہ طور پر واجب نہیں ہوتے۔ ان حقوق میں سے خداوند عالم نے جو سب سے عظیم حق واجب کیا ہے وہ حاکم و والی کا حق عوام پر اور عوام کا حق حاکم و والی پر ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جسے خداوند عالم نے والی و رعایا میں سے ہر ایک فرد پر مقرر فرمایا ہے اور اسے ان کے لئے مایۂ اتحاد و یک جہتی اور دین کی عزت و سرفرازی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ رعایا اسی وقت نیک و صالح رہ سکتی ہیں جب حکام بھی صالح ہوں، اور حکام بھی اس وقت تک صلاح و نیکی سے آراستہ نہ ہوں گے جب تک عوام و رعایا صالح و درست کار نہ ہو۔ پس جب رعایا حاکم کا حق ادا کریں اور حاکم رعایا کے حق کا لحاظ کرے تو حق و عدالت ان کے درمیان محترم و باوقار ہوگی۔ دیانت کے راستے استوار ہو جائیں گے۔ عدل و انصاف کی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی، پیغمبر کی سنتیں اپنی راہ پر چل نکلیں گی نتیجہ میں زمانہ سازگار ہو جائے گا، حکومت کی بقا کی امیدیں پیدا ہو جائیں گی اور دشمنوں کی حرص و طمع، یاس و نا امیدی میں بدل جائے گی۔

اور جب بھی رعایا، حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہو یا حاکم، رعایا پر ظلم و ستم کرنے

لگے تو اتحاد و یکجہتی اختلافات میں بدل جائے گی، ظلم و ستم کی نشانیاں ظاہر ہونے لگیں گی، دین میں مفسدے اور الٹ پھیر بڑھ جائیں گے، سنت و شریعت کی شاہراہیں متروک ہو جائیں گی آخر کار نفسانی خواہشات عمل کا محور قرار پائیں گی، احکام تعطیل کا شکار ہو جائیں گے اور نفسانی بیماریاں شدت سے بڑھ جائیں گی۔ اس وقت بڑے بڑے (امور) حق کے انجام نہ پانے اور بڑے بڑے باطل (امور) کے دھڑلے کے ساتھ انجام پانے سے کوئی وحشت زدہ نہ ہوگا۔ اور جب ایسا ہوگا تو نیکوکار اور صالح افراد ذلیل اور شریر و اوباش عزت دار بن جائیں گے اور اللہ کی عقوبتیں لوگوں کے حق میں بڑھ جائیں گی۔ (خطبہ نمبر ۲۱۴)

اگر حضرت کے اس عمیق، پر مغز اور حکیمانہ کلام پر غور کیا جائے تو ہمیں اس میں حکومت و رعایا کے باہمی حقوق کے سلسلہ میں بہت سے ہدایات اور نکات نظر آتے ہیں جنھیں ہم یہاں اجمالی طور پر ذکر کرتے ہیں:۔

الف) اجتماعی اور سیاسی حقوق، الٰہی حقوق کا ہی ایک حصہ ہیں، جن کا ضائع کرنا خدا کے حق کو ضائع کرنا ہے اس بنا پر ایک صالح سیاسی، قانونی اور شرعی نظام میں اس نظام کے دستورات و قوانین کی پابندی خدا کی اطاعت کے ہم معنی اور اس کی خلاف ورزی الٰہی احکام کی خلاف ورزی ہے۔ اور دیندار سیاسی نظام اور دین مخالف سیاسی نظام کے درمیان یہ بھی ایک امتیازی فرق ہے۔

(ب) حکومت اور رعایا دونوں ایک دوسرے پر حق رکھتے ہیں ان میں سے اگر ایک ان حقوق کی انجام دہی میں کوتاہی کرے تو دوسرے پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس حکومت کا احترام اور اس کی قدر ضروری ہے جو رعایا سے کئے ہوئے اپنے وعدوں کو پورا کرنے میں کوشاں رہے، یوں ہی وفادار رعایا بھی حکومت کے لئے قابل احترام ہے۔

(ج) حکومت و رعایا کے باہمی حقوق دراصل حقوق کی اہم ترین بنیاد ہیں، کیونکہ معاشرہ کے بہت سے حقوق اور حدود ان ہی سے وابستہ ہیں۔ رعایا کی فلاح و رفاہ اور حکومت کا استحکام ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت پر منحصر ہے دین اور مسلمانوں کی عزت و سربلندی، سنن و شریعت کی بقا، اور معاشرہ میں عدل و انصاف کی برقراری کی ضمانت مذکورہ حقوق کے سایہ میں ہی دی جاسکتی ہے جب کہ ملکی سیاست میں حقوق کے تال میل اور اس نظم و ضبط کے درہم و برہم ہونے کا نتیجہ فساد، ظلم بدعت، خیانت، اختلاف، نفس پرستی، حق کی پامالی، باطل کے رواج، مومنین کی ذلت، گمراہوں کی جرأت

وجبارت اور عقوبت الٰہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ اور اپنے ایک اجتماعی و سیاسی خطبہ میں حضرتؑ ان لوگوں کو سرزنش کرتے ہیں جنھوں نے اپنے امام کی اطاعت اس کی منزلت و مقام کے مطابق نہیں کی اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے سیاسی اجتماعی جمود کے حالات پیدا کر دیئے اور اپنے امام کو شدید طور سے غم واندوہ میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ آپ رعایا کے ان حقوق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

«أيها النّاسُ! إنَّ لِي عَلَيْكُمْ حَقّاً وَلَكُمْ عَلَيَّ حَقٌّ، فَأَمَّا حَقُّكُمْ عَلَيَّ فَالنَّصِيحَةُ لَكُمْ وَتَوْفِيرُ فَيْئِكُمْ عَلَيْكُمْ وَتَعْلِيمُكُمْ كَيْلا تَجْهَلُوا وَتَأْدِيبُكُمْ كَيْما تَعْلَمُوا. وَأَمَّا حَقِّي عَلَيْكُمْ فَالْوَفَاءُ بِالْبَيْعَةِ وَالنَّصِيحَةُ فِي الْمَشْهَدِ وَالْمَغِيبِ وَالْإِجَابَةُ حِينَ أَدْعُوكُمْ وَالطَّاعَةُ حِينَ آمُرُكُمْ»

"اے لوگو! میرا تم پر حق ہے اور تمہارا مجھ پر حق ہے۔ تمہارا حق مجھ پر یہ ہے کہ تمہیں نصیحت کروں اور بیت المال سے سب کو برابر اور پورا پورا حصہ دوں، تمہیں جہالت سے دور کرنے کے لئے تعلیم دوں اور ادب سکھاؤں تاکہ تم مہذب و خردمند بنو، اور میرا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ بیعت پر وفادار رہو۔ سامنے اور پیٹھ پیچھے ہمیشہ میرے خیر خواہ رہو جب بھی میں تمہیں بلاؤں تو میری آواز پر لبیک کہو اور جب حکم دوں تو اطاعت کرو۔" (خطبہ/۳۴)

۳۔ اپنے ایک عامل کو جسے آپؑ نے زکوٰۃ و صدقات سے متعلق امور پر مامور کیا تھا، ایک خط کے ذیل میں تحریر فرمایا:۔

«وإنَّ أَعْظَمَ الْخِيانَةِ خِيانَةُ الْأُمَّةِ وَأَفْظَعَ الْغِشِّ غِشُّ الْأَئِمَّةِ»

"بلاشبہ سب سے بڑی خیانت اپنی قوم کے ساتھ خیانت ہے اور بدترین دھوکہ بازی اپنے رہبروں کے ساتھ دھوکہ ہے۔" (خط/۲۶)

۴۔ اپنے لشکر کے بعض سپہ سالاروں کو تحریر کردہ ایک خط میں ان حقوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

«أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ حَقّاً عَلَى الْوالِي أَلاَّ يُغَيِّرَهُ عَلَى رَعِيَّتِهِ فَضْلٌ نالَهُ

ولا طَوْلٌ خُصَّ بِهِ، وَاَنْ يَزِيْدَهُ مَا قَسَمَ اللّٰهُ لَهُ مِنْ نِعَمِهِ دُنُوّاً مِنْ عِبَادِهِ وَعَطْفاً عَلٰى اِخْوَانِهِ»

"بے شک حاکم کا فرض یہ ہے کہ وہ فضل و شرف سے ہمکنار ہونے اور نعمت سے بہرہ ور ہونے کی صورت میں رعایا کے ساتھ اس کے رویہ میں تبدیلی پیدا نہ ہو اللہ نے جو نعمتیں اسے عطا کی ہیں انھیں اس کے بندوں سے اس کی نزدیکی اور اپنے بھائیوں سے مہربانی وہمدردی میں اضافہ کا سبب بننا چاہئے۔" خط/ ۵۰

«اَلَا وَاِنَّ لَكُمْ عِنْدِي اَلَّا اَحْتَجِزَ دُوْنَكُمْ سِرّاً اِلَّا فِي حَرْبٍ. وَلَا اَطْوِيَ دُوْنَكُمْ اَمْراً اِلَّا فِي حُكْمٍ وَلَا اُؤَخِّرَ لَكُمْ حَقّاً عَنْ مَحَلِّهِ وَلَا اَقِفَ بِهِ دُوْنَ مَقْطَعِهِ. وَاَنْ تَكُوْنُوا عِنْدِي فِي الْحَقِّ سَوَاءً فَاِذَا فَعَلْتُ ذٰلِكَ وَجَبَتْ لِي عَلَيْكُمُ النِّعْمَةُ وَلِي عَلَيْكُمُ الطَّاعَةُ وَاَلَّا تَنْكُصُوا عَنْ دَعْوَةٍ وَلَا تُفَرِّطُوا فِي صَلَاحٍ وَاَنْ تَخُوضُوا الْغَمَرَاتِ اِلَى الْحَقِّ»

"آگاہ رہو! کہ تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ اسرار جنگ کے علاوہ کوئی چیز تم سے پوشیدہ نہ رکھوں، شرعی حکم کے علاوہ کسی اور امر میں تمہارے مشورہ سے پہلو تہی نہ کروں تمہارے کسی بھی حق کو پورا کرنے میں تاخیر و کوتاہی نہ کروں اور اسے انجام تک پہنچائے بغیر دم نہ لوں۔ نیز میری نگاہ میں تم سب کا حق برابر ہو، پس اگر میں نے ان تمام چیزوں کو جامۂ عمل پہنا دیا تو تم پر خداوند عالم کی نعمت کا شکر واجب اور میری اطاعت لازم ہے (میری) دعوت پر اپنے قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اور نیک کاموں میں کوتاہی نہ کرو۔ اور حق تک رسائی کے لئے سختیوں اور دشواریوں سے ٹکرا جاؤ۔"

«فَاِنْ اَنْتُمْ لَمْ تَسْتَقِيْمُوا لِي عَلٰى ذٰلِكَ لَمْ يَكُنْ اَحَدٌ اَهْوَنَ عَلَيَّ مِمَّنْ اِعْوَجَّ مِنْكُمْ، ثُمَّ اُعْظِمُ لَهُ الْعُقُوبَةَ وَلَا يَجِدُ فِيهَا رُخْصَةً، فَخُذُوا هٰذَا مِنْ اُمَرَائِكُمْ وَاَعْطُوهُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ مَا يُصْلِحُ اللّٰهُ بِهِ اَمْرَكُمْ. والسلام.

پس اگر تم ان باتوں کے پابند نہ رہے تو تم میں میرے نزدیک کوئی اس شخص سے زیادہ ذلیل و حقیر نہیں ہوگا جو ٹیڑھی راہ اختیار کرے۔ پھر میں اسے سخت سزا دوں گا اور

اس کی تہ تک کسی طرح کی رعایت نہ کروں گا۔ یہ (عہد و پیمان) تم اپنے (ماتحت) سرداروں سے لے لو اور انھیں اپنی طرف سے اس طرح کی سہولتیں فراہم کرو کہ خداوند عالم ان کے ذریعہ تمہارے کام کو آسان کر دے۔ والسلام" (خط/ ۵۰)

اس بحث کے آخر میں دو خاص مطالب کا ذکر ضروری ہے۔ اول، تاجروں اور پیشہ وروں سے متعلق حکومت کی ذمہ داریاں! دوسرے، معاشرہ کے محروم طبقہ سے متعلق حکومت کی ذمہ داریاں!

تاجروں اور پیشہ وروں سے متعلق حکومت کی ذمہ داریاں

مالک اشتر کو لکھے گئے امام علیہ السلام کے سیاسی منشور میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے چنانچہ امام فرماتے ہیں:۔

«ثُمَّ اسْتَوْصِ بِالتُّجارِ وَذَوِي الصِّناعاتِ وأَوْصِ بِهِمْ خيراً، المُقيمِ مِنْهُمْ وَالْمُضْطَرِبِ بِمَا لِهِ وَالْمُتَرَفِّقِ بِبَدَنِهِ، فَإِنَّهُمْ مَوادُّ المَنافِعِ وَأَسْبابُ المَرافِقِ وجُلاَّبُها مِنَ المَباعِدِ وَالمَطارِحِ...»

"پھر تم کو تاجروں اور صنعت گروں کے بارے میں توجہ کی ہدایت دی جاتی ہے اسے سنو اور ان کے بارے میں نیکی کی ہدایت دو۔ یہ لوگ جو یا تو شہر میں مقیم ہیں یا اس کے اطراف میں اپنے مال کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں یا اپنی قوت بازو سے کسب و کار کرتے ہیں، پیداوار کا سرچشمہ اور درآمد کا وسیلہ ہیں اور عالم غربت میں دور دراز کے علاقوں سے نفع و سرمایہ فراہم کرنے والے ہیں..."

اس کے بعد اس طبقہ کو دامن گیر ہونے والی کمزوریوں اور گمراہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

«... وَاعْلَمْ ـ مَعَ ذلِكَ ـ أَنَّ في كَثيرٍ مِنهُم ضِيقاً فاحِشاً وَشُحّاً قَبيحاً وَاحْتِكاراً لِلْمَنافِعِ وَتَحَكُّماً فِي البِياعاتِ وَذلِكَ بابُ مَضَرَّةٍ لِلْعامَّةِ وَعَيْبٌ عَلَى الْوُلاةِ. فَامْنَعْ مِنَ الاِحْتِكارِ فَإِنَّ رَسُولَ اللّهِ ـ صَلَّى اللّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ ـ مَنَعَ مِنْهُ. وَلْيَكُنْ الْبَيْعُ بَيْعاً سَمْحاً بِمَوازينِ عَدْلٍ وَأَسْعارٍ لا تُجْحِفُ بِالفَريقَيْنِ مِنَ البائِعِ

وَالْمُبْتَاعِ، فَمَنْ قَارَفَ حُكْرَةً بَعْدَ نَهْيِكَ اِيَّاهُ فَنَكِّلْ بِهٖ وَعَاقِبْهُ فِيْ غَيْرِ اِسْرَافٍ»

"..... ان سب کے باوجود یہ جان لو کہ ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو اپنی ذلیل حرکتوں اور سختیوں اور بے شرمانہ ظلم و سرکشی، لوگوں کی ضرورت کے سامانوں کی ذخیرہ اندوزی کرکے چیزوں کے من مانے اور سخت دام لگاتے ہیں حالانکہ یہ اعمال عوام کے لئے نقصان دہ اور حکام کی رسوائی کا سبب بنتے ہیں - لہٰذا لوگوں کو احتکار و ذخیرہ اندوزی سے روکو، کیونکہ پیغمبر خدا نے احتکار سے منع فرمایا ہے۔ خرید و فروخت سہل و آسان اور عادلانہ معیاروں کی بنیاد پر ہونا چاہئے - قیمتیں طرفین کے لئے انصاف کے ساتھ معین ہوں - اب اگر کوئی شخص احتکار سے روکے جانے کے باوجود اس طرح کا اقدام کرتا ہے، اس کی تنبیہ کرو اور اسے حد کے مطابق سزا دو" خط / ۵۳

صنعت گروں اور مصرف کرنے والوں کی حمایت

بازار، تاجر پیشہ افراد اور صنعت کاروں سے متعلق حکومت کی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں چند بنیادی باتیں حسب ذیل ذکر کی جاتی ہیں :-

۱- اہل بازار، تاجر، پیشہ ور افراد اور صنعت کار جو حکومت کے لئے نفع و سرمایہ پیدا کرنے کی اصل قوت اور عوام کی ضرورتیں پوری کرنے کا ذریعہ ہیں، حکومت کو ان کی حمایت کرنی چاہئے اور ان کے کاروبار کو جاری رکھنے کے لئے انھیں ضروری سہولتیں فراہم کرنی چاہئے۔

۲- حکومت کو اسی طبقہ کے افراد کے پیدا کردہ مالی الٹ پھیر، غلط فوائد، احتکار اور کالا بازاری وغیرہ کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے اور انھیں اس بات کی مہلت نہ دینی چاہئے کہ عوام کے کھانے پینے کی چیزیں اور دوسری ضرورتیں ان ظالموں کے ہاتھوں تباہ ہوں - اور اگر ضروری ہو تو ایسے غلط افراد کو ظلم و زیادتی کے بغیر مناسب سزائیں دے اور ان پر جرمانے عائد کرے۔

۳- تمام چیزوں کی عادلانہ اور طے شدہ قیمتیں حکومت کو معین کرنا چاہئے جس سے ہر شخص اپنی

مرضی سے من مانی قیمتیں معین نہ کرے جس سے بازار اور ملکی اقتصاد میں ہرج و مرج کی صورت پیدا ہو۔

۲۔ معاشرہ کے غریبوں سے متعلق حکومت کی ذمہ داری

معاشرہ کے غریب محروم اور نادار طبقہ کے سلسلہ میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

«ثُمَّ اللهَ اللهَ فِي الطَّبَقَةِ السُّفْلَى مِنَ الَّذِينَ لَا حِيلَةَ لَهُمْ، مِنَ الْمَسَاكِينِ وَالْمُحْتَاجِينَ وَأَهْلِ الْبُؤْسَى وَالزَّمْنَى، فَإِنَّ فِي هٰذِهِ الطَّبَقَةِ قَانِعاً وَمُعْتَرّاً وَاحْفَظْ لِلّٰهِ مَا اسْتَحْفَظَكَ مِنْ حَقِّهِ فِيهِمْ وَاجْعَلْ لَهُمْ قِسْماً مِنْ بَيْتِ مَالِكَ، وَقِسْماً مِنْ غَلَّاتِ صَوَافِي الْإِسْلَامِ فِي كُلِّ بَلَدٍ، فَإِنَّ لِلْأَقْصَى مِنْهُمْ مِثْلَ الَّذِي لِلْأَدْنَى، وَكُلٌّ قَدِ اسْتُرْعِيتَ حَقَّهُ، فَلَا يَشْغَلَنَّكَ عَنْهُمْ بَطَرٌ، فَإِنَّكَ لَا تُعْذَرُ بِتَضْيِيعِكَ التَّافِهَ لِإِحْكَامِكَ الْكَثِيرَ الْمُهِمَّ فَلَا تُشْخِصْ هَمَّكَ عَنْهُمْ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لَهُمْ وَتَفَقَّدْ أُمُورَ مَنْ لَا يَصِلُ إِلَيْكَ مِنْهُمْ مِمَّنْ تَقْتَحِمُهُ الْعُيُونُ وَتَحْقِرُهُ الرِّجَالُ، فَفَرِّغْ لِأُولٰئِكَ ثِقَتَكَ مِنْ أَهْلِ الْخَشْيَةِ وَالتَّوَاضُعِ، فَلْيَرْفَعْ إِلَيْكَ أُمُورَهُمْ. ثُمَّ اعْمَلْ فِيهِمْ بِالْإِعْذَارِ إِلَى اللهِ يَوْمَ تَلْقَاهُ. فَإِنَّ هٰؤُلَاءِ مِنْ بَيْنِ الرَّعِيَّةِ أَحْوَجُ إِلَى الْإِنْصَافِ مِنْ غَيْرِهِمْ. وَكُلٌّ فَأَعْذِرْ إِلَى اللهِ فِي تَأْدِيَةِ حَقِّهِ إِلَيْهِ.»

"پھر خدارا خدارا! معاشرہ کے نچلے طبقہ یعنی ان لوگوں کا خیال رکھنا جو فقیر و محتاج، گرفتار بلا، درد کے مارے اور معذور افراد ہیں۔ اس طبقہ میں عزت دار اور محتاج افراد بھی ہیں۔ خداوند عالم نے ان لوگوں سے متعلق تم پر جو حق معین کیا ہے اسے ادا کرو۔ ان کے لئے بیت المال اور اسلام و مسلمانوں سے متعلق نہروں سے حاصل ہونے والے اموال میں سے ایک حصہ معین کردو کیونکہ دور رہنے والے افراد بھی نزدیک رہنے والوں کی مانند حقدار ہیں اور تم ان سب کے حق کے ذمہ دار ہو۔ دیکھو غرور و نخوت تمہیں اس فریضہ کی ادائیگی سے روکنے نہ پائے کیونکہ اس صورت میں تم زیادہ اہم امور کی انجام دہی کے لئے معمولی اور چھوٹے چھوٹے حقوق کو ضائع کر کے قابل معافی قرار نہ پاؤ گے۔ ان کے حالات سے غافل نہ ہو، ان کی طرف سے نخوت سے منہ نہ پھیرو۔ ان میں ایسے اشخاص

کے حالات وکوائف کی تحقیق وچھان بین کرو جنھیں لوگ حقارت و بے توجہی کی بنا پر تم تک نہیں پہنچاتے اور ان کے مشکلات کے حل نیز ان کے کاموں کی انجام دہی کے لئے قابل اطمینان خدا ترس اور متواضع افراد سے کام لو۔ کوشش کرو کہ ان محروم افراد کے حالات و کیفیات تم تک پہنچائے جائیں۔ اور تم جس طرح قیامت میں خدا کے سامنے عفو کی امید رکھتے ہو یوں ہی ان کے ساتھ پیش آؤ کیونکہ ملت میں یہ لوگ عدل و انصاف کے سب سے زیادہ محتاج ہیں، لہٰذا سب کا حق خدا کے حکم کے مطابق ادا کرو۔"

یہ نچلا طبقہ جو محروم اور فراموش شدہ افراد کا طبقہ ہے، دنیا کے تمام اجتماعی و سیاسی نظاموں میں کسی معاشرہ کے اندر کبھی بھی کسی شمار میں نہیں لایا جاتا۔ یہ لوگ ہمیشہ ظالموں اور جابروں کے زیر ستم اپنے بنیادی اور ابتدائی قسم کے اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی حقوق سے بھی محروم رہے ہیں، جب کہ صورت حال یہ ہے کہ اسی گروہ کی اولاد اور خود یہ لوگ حکومتوں کی سب سے زیادہ خدمت کرتے آئے ہیں؛ فوجوں کے سپاہی، درباروں کے محافظ نیز حکام کی خوشیوں اور غموں میں قربانیوں کا بکرا بننے والے زیادہ تر اسی طبقہ کے افراد ہیں، ان کی تقدیریں گویا بدترین تقدیریں ہیں۔

صدیوں اور زمانوں کے طول و عرض پر محیط حاکم دنیوی سیاست کے برخلاف تنہا وہ سیاست جس نے الٰہی معارف اور آسمانی تعلیمات سے الہام حاصل کرتے ہوئے اس کمزور طبقہ پر عنایتیں کی ہیں اور ان کے اقدار کو زندہ کرنے کی راہ میں قدم اٹھایا ہے، وہ دین اور الٰہی مکتب فکر سے نشأۃ پانے والا سیاسی نظام ہی ہے۔ اصولی طور پر انبیائے الٰہی اسی لئے مبعوث ہوئے تھے کہ قوموں و ملتوں اور انسانی معاشرہ کے محروم وستم دیدہ افراد کو ظالم و جابر اور خونخوار حکام کے چنگل سے نجات دلائیں اور دنیا میں رائج ان حاکم معیاروں کو بدل ڈالیں جو معاشرہ میں طبقات کی تعیین و تقسیم کا محور بنے ہوئے تھے۔

حضرت علی ابن ابی طالبؑ، جنھوں نے اپنی اجتماعی سیاست کی بنیاد عملی طور پر محروموں کی حمایت اور انھیں اہمیت دیئے جانے کی اساس پر قائم کی تھی اپنے اجتماعی ــ سیاسی منشور میں مالک اشتر سے ان محروم طبقوں کے ضائع شدہ حق کے سلسلہ میں تاکید فرمائی ہے۔

یہاں ہم اس سلسلہ میں امامؑ کی مذکورہ فرمائشات کے چند اساسی نکتوں پر ایک سرسری نگاہ

ڈالتے ہیں :-

(۱) ان کی مادی ضرورتیں اور زندگی کا خرچ بیت المال سے دیا جانا چاہیئے نیز ہر شہر اور علاقہ کی آمدنی اس علاقہ کے غریب و محروم افراد کی ضرورتوں پر صرف ہونی چاہیئے۔ یہ نہ ہو کہ وہ آمدنیاں مرکزی شہروں کو بھیج دی جائیں اور ان کے اصلی مالک و حقدار اس سے محروم رہیں۔

(۲) حکومت کے ذمہ داروں پر واجب ہے کہ ملک کے اہم مشاغل میں مصروف ہونے کی بنا پر ان لوگوں کی ناگفتہ بہ صورت حال سے غافل نہ رہیں، کیونکہ پھر وہ خدا کے حضور اس کا کچھ جواب نہ دے پائیں گے۔

(۳) حکومت کے ذمہ داروں کو چاہیئے کہ اس تحقیر شدہ طبقہ کے افراد سے کشادہ روئی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کریں اور ان کی روح میں پڑی ہوئی حقارت و بے مائیگی کی گرہیں کھول دیں۔

(۴) حکام پر لازم ہے کہ صالح، خدا ترس اور متواضع افراد کو اس طبقہ کے حالات کا نگران اور ذمہ دار بنائیں تاکہ وہ پوری دل سوزی اور ہمدردی کے ساتھ ان کے کام کو انجام دیں اور حاکم کو اس کے نتائج سے آگاہ کریں۔

بے سہارا بچے اور بوڑھے

معاشرہ کے محروم طبقات میں ایسے بے سہارا افراد بھی ہیں جن کو سب سے زیادہ اہمیت دی جانی چاہیئے۔ یہ یتیم و بے سرپرست بچے اور ضعیف و ناتواں بوڑھے ہیں کہ امام نے اپنے ہدایات میں الگ سے ان کا ذکر فرمایا ہے :-

«وَ تَعَهَّدْ اَهْلَ اَلْيُتْمِ وَذَوِي اَلرِّقَّةِ فِي اَلسِّنِّ مِمَّنْ لاَ حِيلَةَ لَهُ، وَلاَ يَنْصِبُ لِلْمَسْأَلَةِ نَفْسَهُ وَذٰلِكَ عَلَى اَلْوُلاَةِ ثَقِيلٌ، وَالْحَقُّ كُلُّهُ ثَقِيلٌ وَقَدْ يُخَفِّفُهُ اَللّٰهُ عَلَى أَقْوَامٍ طَلَبُوا اَلْعَاقِبَةَ فَصَبَّرُوا أَنْفُسَهُمْ، وَوَثِقُوا بِصِدْقِ مَوْعُودِ اَللّٰهِ لَهُمْ.»

"یتیم بچوں اور سال خوردہ بوڑھوں کی سرپرستی کرو جن کا نہ کوئی سہارا ہے اور نہ وہ سوال کے لئے اٹھتے یا ہاتھ پھیلاتے ہیں، یہ امر حکام کے لئے اگرچہ سخت اور گراں ہے اور یقیناً حق کل کا کل سخت اور سنگین ہے لیکن بلاشبہ خداوند عالم ان لوگوں کے لئے جو عاقبت کی بھلائی کے خواہاں، صابر اور اللہ کے وعدہ پر مطمئن ہوں ــــ اس سنگین ذمہ داری کو قابل تحمل بنا دیتا ہے۔"

تہمت کے اقسام

جناب ناصر باقری بید ھندی

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

مجموعی طور سے تہمت کو آٹھ قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱. خدا پر تہمت

خداوند عالم کی ذات اقدس پر بہتان لگانا یعنی وہ ذات جس کا دامن کبریائی ہر طرح کے عیب و نقص سے پاک و منزہ ہے، اس کی طرف کسی چیز کی ناروا نسبت دینا۔ سورۂ صف آیت ۷ میں ہے:۔

"ومن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ الکذب"

"جو شخص ذات اقدس پروردگار پر تہمت لگائے اس سے زیادہ ظالم اور کون ہوگا"۔

اور سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"ویلکم لا تفتروا علی اللہ کذباً فیسحتکم بعذاب" (آیت/۶۱)

وائے ہو تم پر خدا پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ کہ وہ تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔[۱]

---

[۱] اس کے علاوہ اس موضوع سے متعلق سورۂ عنکبوت کی ۶۵ ویں، سورۂ انعام کی ۲۱ ویں اور ۹۳ ویں، سورۂ ھود کی ۱۸ ویں سورۂ انعام کی ۱۴۴ ویں سورۂ اعراف کی ۳۷ ویں، سورۂ یونس کی ۱۷ ویں، سورۂ کہف کی ۱۵ ویں، اور سورۂ زمر کی ۳۲ ویں آیتیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

خداوند عالم کی ذات اقدس پر تہمت کا جائزہ چند اقسام کے ذیل میں لیا جا سکتا ہے :-

الف : بعض مشرکین نے خدا کی طرف صاحب اولاد ہونے کی نسبت دی ہے اور بعض انبیاء کرام منجملہ حضرت عیسیٰ اور عزیرؑ نیز کچھ فرشتوں کو خداوند عالم کی اولاد قرار دیتے ہیں کہ خداوند عالم نے مندرجہ ذیل آیت میں مشرکین کے اس گروہ کی توبیخ و تنبیہ فرمائی ہے :-

وینذر الذین قالوا اتخذ اللہ ولداً مالھم بہ من علم ولا لابائھم کبرت کلمۃً تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا" (کہف/۵)

یعنی : جو لوگ خدا کے لئے فرزند قرار دیتے ہیں انھیں اللہ کے دردناک عذاب سے ڈرائیے وہ اور ان کے آباد اجداد اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں کہ کیسی بڑی اور کتنی سخت بات زبان پر لا رہے ہیں اور جھوٹ کے علاوہ کوئی اور بات ان کی زبانوں پر نہیں آتی ۔

ب : مسیلمہ کذاب ، اسود عنسی ، محمد بن نصیر نمیری اور ادھر گزشتہ صدیوں میں سید علی محمد باب ، میرزا حسین علی بہا ، مرزا غلام احمد قادیانی اور احمد کسروی جیسے لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور بزعم خود الٰہی رسالت کے حامل رہے ہیں ۔ ڈاکٹر بحریہ اوچ اوک نے اپنی کتاب "تاریخ پیامبران دروغین در صدر اسلام" میں ، جسے ڈاکٹر وہاب ولی نے فارسی میں ترجمہ بھی کیا ہے ان میں سے صدر اسلام میں موجود چار افراد کی سیاسی و اعتقادی زندگی پر بحث و تحقیق کی ہے اور ان کے ظاہر ہونے کے اسباب و علل بھی بیان کئے ہیں ۔

اذا کان الغراب دلیل قوم سیھدیھم سبیل الھالکین

اگر کوا کسی قوم کی رہبری اختیار کرلے تو انھیں سوائے ہلاکت و گمراہی کے کسی اور طرف نہ لے جائے گا۔[1]

---

[1] سنہ ۱۲۶۰ھ میں سید کاظم رشتی کی وفات کے بعد سید علی محمد باب نے شروع میں ذکریت کا دعویٰ کیا تاکہ خود کو آیت شریفہ "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" اور آیت "فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون" میں خود کو ذکر کے مصداق کی حیثیت سے پیش کرے اس کے بعد

اور اسی سلسلہ کی ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے :-

ومن اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا او قال اوحی الیّ ولم یوح الیہ شیٔ ومن قال سانزل مثل ما انزل اللہ

اس نے بابیت (یعنی الٰہی معارف کا باب اور امام مہدیؑ سے اتصال کا راستہ) کا دعویٰ کیا، پھر مہدیت کا دعویٰ کیا پھر رفتہ رفتہ نبوت، شارعیت اور اس دعوے کے ساتھ ہی کہ خدا کی جانب سے اس کے پاس وحی آتی ہے اس نے ایک نئے دین کی بنیاد رکھی اور آخر کار اس نے ان پے در پے دعوؤں سے بھی آگے بڑھتے ہوئے الوہیت اور اپنے آپ میں خدا کے حلول کا دعویٰ بھی کر ڈالا۔ اور سرانجام پہلی بار فارس کے حاکم حسین علی خان کے حکم سے شیراز میں اور دوسری بار ناصر الدین شاہ کے حکم سے تبریز میں جو اس وقت وہاں ولی عہدی کی حیثیت سے تھا، اس کے اور بزرگ علماء کے درمیان جو بحث اور مناظروں کے جلسے منعقد ہوئے۔ علماء نے اس کے پوچ اور فاسد عقائد و نظریات کو سن کر اس کے کفر کا فتویٰ دیتے ہوئے اس کے قتل کا حکم صادر کر دیا، بالآخر ناصر الدین شاہ قاچار اور امیر کبیر کی موافقت سے اس حکم قتل پر عمل درآمد ہوا اس طرح اس کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ سید باب نے اپنے شاگردوں اور مریدوں میں سے مرزا یحییٰ نامی ایک جوان کو جسے اس نے "صبح ازل" کا لقب دیا تھا اپنا جانشین قرار دیا لیکن اس کے سوتیلے بھائی مرزا حسین علی نے جو اس سے بڑا بھی تھا اسے دھوکا دے کر اسے نظر بند کر دیا اور خود پہلے (من یظہرہ اللّٰہی یعنی مظہر الوہیت پھر مہدیت کا دعویٰ کیا اس کے بعد رجعت حسینی اور رجعت مسیح کا ادعا کیا اور پھر تبدریج رسالت و شارعیت اور اپنے وجود میں خدا کے حلول اور اپنی شکل میں خدا کے تجسد و تجسم کا دعویٰ بھی کر ڈالا اور بہت سے مسلمانوں کو گمراہ کیا اور سرانجام ۲ ذیقعدہ ۱۳۰۹ھ کو عکا میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے ہوئے واصل جہنم ہوا اور وہیں دفن کیا گیا۔

شیعہ علماء میں سے بہت سے بزرگوں نے اس موضوع سے متعلق کتابیں لکھی ہیں اور باب و بہاء کے عقائد کی حقیقت کھولی ہے جن میں سے چند کتابوں اور مصنفوں کے نام یہاں ذکر کئے جاتے ہیں :-

۱۔ "مفتاح الابواب" (باب و بہاء کی صحیح تاریخ) تالیف مرزا مہدی خان زعیم الدولہ تبریزی، ترجمہ حسن فرید گلپائگانی، طبع کتابخانہ شمس تہران (عربی)

۲۔ "محاکمہ و بررسی در تاریخ و عقائد و احکام باب و بہا"، ڈاکٹر ح۔ م۔ ت۔ طبع کتابفروشی مصطفوی (فارسی)

ولوتریٰ اذ الظّالمون فی غمرات الموت والملٰئکة باسطوٓا
ایدیھم اخرجوا انفسکم الیوم تجزون عذاب الھون
بما کنتم تقولون علی اللہ غیر الحق وکنتم عن آیاتہ
تستکبرون (سورۂ انعام / ۹۳)

یعنی: اس شخص سے بڑا ظالم اور ستمگر کون ہے جس نے خدا پر تہمت لگائی اور اس کا دعویٰ کیا کہ ہمارے پاس وحی آئی جب کہ خدا کی طرف سے اس پر کچھ بھی وحی نہیں ہوئی ،

۳۔ "خاتمیت پیامبر اسلام وابطال تحلیلی بابیگری و بہائیگری وقادیانی گری" ۔ یحییٰ نوری، طبع مجمع مطالعات وتحقیقات اسلامی ومجمع معارف اسلامی (فارسی)

۴۔ "بہائی چہ میگوید؟" ۔ جواد تہرانی، طبع دار الکتب الاسلامیہ (فارسی)

۵۔ "بی بہائی باب وبہاء" ۔ محمد علی خادمی (فارسی)

۶۔ "جمال الہٰی" ۔ سید عبدالکریم موسوی اردبیلی (فارسی)

۷۔ "نصایح الھدیٰ" ۔ محمد جواد بلاغی، طبع بغداد، ترجمہ علامہ فانی، طبع دار التبلیغ اصفہان (عربی)

۸۔ "بہائیت دین نیست" ۔ ابوتراب ہدائی، خراسانی پبلیکیشن (فارسی)

۹۔ "بہائیت یا خیانت عجیب" ۔ سید مہدی رضوی (فارسی)

۱۰۔ البھائیة تاریخھا وعقیدتھا وصلتھا بالباطنیة والصھیونیة ۔ عبدالرحمٰن الوکیل (عربی)

۱۱۔ "سیری در کتب بہائی بہائیان" ۔ رضا سلطان نژاد

۱۲۔ "مزدوران استعمار در لباس مذہب" ۔ سید ضیاء الدین روحانی

۱۳۔ "خاتمیت" ۔ علی امیر پور

۱۴۔ "چہار شب جمعہ" ۔ جلال دری

۱۵۔ "پنجۂ خونین استعمار در آستین باب" ۔ احمد رحیمی کاشانی

۱۶۔ "فلسفۂ نیکو" مرزا حسن نیکو مبلغ سابق بہائیت

یوں ہی وہ شخص جو کہتا ہے کہ جو کچھ خدا نے پیغمبر ص پر نازل کیا ہے میں بھی اسی کے جیسا (کلام) نازل کروں گا؟ (اور اے رسول ص) کاش آپ دیکھتے کہ یہ ظالم سکرات موت کی سختیوں میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور ملائکہ اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے ان سے کہہ رہے ہیں کہ اپنی جانیں نکالو کہ آج تم کو اس جھوٹ کے بدلہ میں جو تم نے خدا پر ناحق باندھا ہے اور اس کی نشانیوں سے منہ موڑا ہے، دردناک عذاب دیا جائے گا"

۱۷ــ "کشف الحیل" عبد الحسین آوارہ مشہور بہ آیتی (سابق بہائی مبلغ)

۱۸ــ البہائیۃ ــ محمد حسین کاشف الغطاء

۱۹ــ گفتار خوش یارقلی

۲۰ــ کینیاز دالکورکی

۲۱ــ "انتظار قائم آل محمد" بجواب ظہور قائم آل محمد ۲ جلد از علامہ ظفر الحسن ھندی مطبوعہ الجواد بک ڈپو (اُردو)

۲۲ــ "بہائیوں کا کلام اللہ" از مولانا سعید اختر گوپالپوری ھندی مطبوعہ الجواد بک ڈپو۔ بنارس۔ (اُردو)

● یہاں ہم قادیانیوں کے جواب میں لکھی جانے والی چند کتابوں کا ذکر بھی کئے دیتے ہیں!۔

۱ــ الرد علی الاحمدیۃ والقادیانیۃ، از طاہر بن خالد آتاسی (مفتی شہر حمص متوفی ۱۳۵۹ھ) مطبوعہ

۲ــ کتاب الابرار، از ابو الحسن ابن حسام السلطنہ بن فتح علی شاہ قاچار (معروف بہ حاج شیخ الرئیس) ماخوذ از کتاب ریحانۃ الادب ج ۲ ص

۳ــ "صفر الامۃ علی رأس الحمامۃ" از ابو الحسن میرزا ابن حسام السلطنہ ... یہ کتاب خود غلام احمد قادیانی کی کتاب حمامۃ البشری کے جواب میں لکھی گئی ہے۔

۴ــ طرد الخلافہ در جواب ستر الخلافہ از قادیانی، یہ کتاب بھی اسی مصنف کی ہے۔

۵ــ المصابیح فی نقض مفتریات القادیانیین، از علامہ شیخ محمد جواد بلاغی۔ ماخوذ از کتاب علماء معاصر و ریحانۃ الادب، ج ۱/ ۲۷۹

۶ــ مذہب قادیانی از ابو الحسن ندوی ۷ــ مسئلہ قادیانی گری ابو الاعلیٰ مودودی ۸ــ گروہ قادیانی۔ از محمد خضر الحسنی

مذکورہ بالا تینوں کتابیں انتشارات رابطۃ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ سے شائع ہو چکی ہیں۔

۹ــ "البہائیۃ والقادیانیۃ" از الدکتور محمد حسن اعظمی شائع شدہ از مؤسسہ الاعلمی بیروت

ج ۔ خداوند قدوس کی جانب ایک دوسری قسم کی تہمت اپنے خودساختہ احکام کو خدا کی طرف منسوب کر دینا ہے کہ اس طرح کی تہمتیں لگانے والوں کی قرآن میں یوں مذمت اور تکذیب کی گئی ہے:۔

ماجعل اللہ من بحیرۃ ولا سائبۃ ولا وصیلۃ ولا حام ولکن الذین کفروا یفترون علی اللہ الکذب واکثرھم لا یعقلون (سورۂ مائدہ/۱۰۳)

یعنی: خداوند عالم نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کے لئے کوئی حکم مقرر نہیں فرمایا ہے بلکہ کافروں نے ان احکام کو اپنے پاس سے گڑھ لیا ہے اور انھیں خدا سے منسوب کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر و بیشتر اپنی عقلوں کو بروئے کار نہیں لاتے۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:۔

قل ارءیتم ما انزل اللہ لکم من رزق فجعلتم منہ حراماً وحلالاً قل آللہ اذن لکم ام علی اللہ تفترون (یونس/۵۹)

یعنی: اے پیغمبر اکرمؐ آپ مشرکوں سے کہئے کہ آیا جو رزق خداوند عالم نے تم پر نازل فرمایا ہے (اور حلال قرار دیا ہے) ان میں سے تم اپنی طرف سے بعض کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیتے ہو کیا ایسا تم خدا کے حکم سے کرتے ہو یا اس کی ذات اقدس پر تہمت لگاتے ہو...

---

[۱] "باب" کے جعلی اور من گھڑت احکام اس کی کتاب "بیان" اور اس کے بعض حصے "مفتاح باب الابواب ص۱۶۸ کے آغاز سے.... نیز محاکمہ و بررسی باب و بہاء، ج ۱۲، ص۴۱ اور "راہ راست" ج ۱ ص ۶۵-۶۶ مصنف مسیح اللہ رحمانی (محفل بہائیان کے سابق رئیس) میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

[۲] بحیرہ: اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو پانچ بچے جنے اور پانچواں نر ہو کہ اس پر سواری کرنے اور اسے قتل کرنے سے پرہیز کرتے تھے اور اسے پانی کے کنارے یا چراگاہ سے نہیں ہنکاتے تھے اور بقولے جب اونٹنی کا پانچواں بچہ نر ہوتا تھا تو اسے ذبح کر دیتے تھے اور اس کا گوشت سب پر مباح ہوتا تھا اور اگر مادہ جنتی تھی تو اس کے کان چیر ڈالتے اور اس کے ذبح کے وقت خدا کا نام نہ لیتے تھے نیز عورتوں کا اس کے گوشت میں کوئی حصہ نہ ہوتا تھا۔

سائبہ: وہ جانور جسے بتکدہ پر وقف کر دیتے تھے یا بقولے وہ اونٹنی جو دو مرتبہ پے در پے مادہ جنے۔

د ۔ یہودی علماء نے توریت میں بیان شدہ پیغمبر اکرمؐ کے اوصاف میں تحریف کی اور اسے خدا کی طرف منسوب کردیا اور یہ ظاہر کیا کہ پیغمبر اسلامؐ کے اوصاف توریت میں دوسری طرح سے بیان ہوئے ہیں۔ خدا ان لوگوں کی قرآن مجید میں یوں توبیخ فرماتا ہے :۔

فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھٰذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمناً قلیلاً فویل لھم مما کتبت ایدیھم و ویلٌ لھم مما یکسبون (بقرہ /۷۹)

یعنی : وائے ہو ان لوگوں (یہودیوں) پر جو اپنے ہاتھوں سے کچھ چیزیں لکھ کر اسے خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں تاکہ انھیں دنیا کی حقیر دولت کے عوض فروخت کریں لعنت ہو ان پر، ان کی تحریروں پر اور لعنت ہو اس چیز پر جو وہ حاصل کرتے ہیں۔

ھ ۔ یہودی اپنی ان تمام ترخیانتوں کے باوجود جن میں سے ایک سامری کے گوسالہ کی پرستش تھی اس بات کے مدعی تھے کہ بارگاہ عدل الٰہی میں چند دنوں سے زیادہ خدا کی آتش غضب کا شکار نہ ہوں گے اور خدا ان کے لئے علاحدہ حساب و کتاب رکھے گا کہ قرآن کریم اس بے بنیاد تہمت کی رد کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے :۔

وقالوا لن تمسنا النار الا ایاماً معدودۃ قل اتخذتم عند اللہ عھداً فلن یخلف اللہ عھدہ ام تقولون علی اللہ مالا تعلمون

(بقرہ / ۸۰)

ان (یہودیوں) نے کہا کہ ہم چند دنوں سے زیادہ عذاب الٰہی کی آگ میں گرفتار نہ ہوں گے اے پیغمبرؐ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ کیا تم جو یہ کہہ رہے ہو اس کا خدا سے تم نے وعدہ لے لیا ہے کہ وہ ہرگز اپنے وعدے سے نہیں پھرتا ؟ یا تم بزعم خود بے سمجھے بوجھے کسی چیز کو

وصیلہ : وہ گوسفند یا بکری جو ایک ہی مرتبہ میں نر و مادہ دو بچے جنتی اس کا دودھ اور بال صرف مردوں کے لئے مباح تھا اور بقول وہ گوسفند جو پانچ مرتبہ میں دس مادہ پے در پے جنتی تھی عورتوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا

حام : وہ نر شتر جس کی صلب سے دس بچے پیدا ہوتے تھے اسے خود اپنا پشت پناہ کہا جاتا تھا اور اس پر بار نہیں لادا جاتا تھا

خدا کی طرف منسوب کرتے ہو"۔

آخر میں اس بحث کو ہم اس آیۂ کریمہ کے ذکر کے ساتھ ختم کرتے ہیں :۔

"قل ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون"

(یونس / ٦٩)

یعنی : اے رسولؐ کہہ دیجئے ! جو لوگ خدا پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔

٢۔ انبیاءؑ، ائمہؑ اور قرآن پر تہمت

وہ تہمتیں جنھیں قرآن نے مشرکوں کی زبان سے مخصوص پیغمبر اسلامؐ کے سلسلہ میں نقل کیا ہے حسب ذیل ہیں :۔

١۔ ساحر

وعجبوا ان جاءھم منذرٌ منھم وقال الکافرون ھٰذا ساحرٌ کذّاب (ص / ٤)

اور ان لوگوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان ہی میں کا ایک ڈرانے والا پیغمبر ان کے پاس آیا، اور کافروں نے کہا کہ یہ (شخص) جادوگر اور بہت جھوٹا ہے۔

٢۔ کاہن

"ولا بقول کاھنٍ قلیلاً ما تذکرون" (حاقہ / ٤٢)

..... اور نہ کسی کاہن کی (خیالی) بات اور تم لوگ تو بہت کم غور کرتے ہو۔

٣۔ مجنون

وقالوا یا ایھا الذی نزّل علیہ الذکر انک لمجنون (حجر / ٦)

اور (کفار نے) کہا اے وہ ! جس پر وحی و کتاب نازل کی گئی ہے بلاشبہ تو مجنون و دیوانہ ہے۔

٤۔ مسحور

وقال الظالمون ان تتبعون الا رجلاً مسحوراً (فرقان / ٨)

اور ظالموں نے کہا کہ تم لوگ تو ایسے آدمی کی پیروی کرتے ہو جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔

۵۔ معلّم (تعلیم دیا ہوا، پڑھایا ہوا)

وقد جاءهم رسول مبين، ثم تولوا عنه وقالوا معلّم مجنون (دخان/۱۳،۱۴)

اور جب ان کے پاس صاف صاف بیان کر دینے والا پیغمبر آیا تو ان لوگوں نے اس سے منھ پھیر لیا اور کہا کہ یہ تو پڑھایا ہوا دیوانہ ہے۔

۶۔ مفتری

قالوا انّما انت مفتر بل اکثرهم لا یعلمون (نحل/۱۰۱)

ان لوگوں نے کہا تم بلاشبہ تہمت و الزام لگانے والے ہو بلکہ ان میں سے بہتیرے نہیں جانتے

۷۔ کذاب

وعجبوا ان جاءهم .... الخ آیت نمبر ایک ملاحظہ فرمائیں

۸۔ شاعر

ام یقولون شاعر نتربص به ریب المنون (طور/۳۰)

کیا یہ لوگ (تم کو) شاعر کہتے ہیں، ہم تو اس بارے میں زمانہ کے حادثات کا انتظار کر رہے ہیں۔

یہ تہمتیں صرف پیغمبر اسلامؐ کی شان اقدس کو نہیں لگائی گئی ہیں بلکہ کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جسے لوگوں نے جادوگر یا دیوانہ نہ کہا ہو:۔

کذالك ما اتی الّذین من قبلهم من رسول الّا قالوا ساحر و مجنون (الذاریات/۵۲)

"اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس جو بھی پیغمبر آتا تھا وہ اس کو جادوگر اور دیوانہ کہتے تھے۔"

اب ہم یہاں مذکورہ بالا موضوع کے تحت چند قرآنی آیتیں بطور مثال پیش کرتے ہیں:۔

الف: ومن اظلم ممّن افتریٰ علی الله کذبًا او کذّب بالحقّ لمّا جاءهٗ الیس فی جهنّم مثویً للکافرین (عنکبوت/۶۸)

"اور جو شخص اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا جب اس کے پاس کوئی سچی بات آئے تو جھٹلا دے اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا اور کیا ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم نہیں ہے؟"

"ب" دشمنان رسول خدا نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ آپ کس مذہب کی پیروی کرتے ہیں؟ فرمایا: اپنے پدر

ابراہیمؑ کے مذہب کی۔ تو ان لوگوں نے کہا کہ ابراہیمؑ گوشت اور اونٹنی کے دودھ کو حرام جانتے تھے اور اور آپ اسے کھاتے ہیں، کیا آپ ان کے مذہب کے خلاف عمل کرتے ہیں؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: تم ابراہیمؑ پر تہمت لگاتے ہو اور ان کی طرف اس طرح کی جھوٹی نسبت دیتے ہو۔ وہ لوگ اپنی بات پر اڑے رہے یہاں تک کہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبرؐ پر آیت نازل فرما کر اس کے ذریعہ پیغمبر اسلامؐ کے عمل کی تائید و تصدیق فرمائی اور تہمت لگانے والوں کی سرزنش کی:۔

فمن افترىٰ على الله الكذب من بعد ذالك فاولئك هم الظالمون (آل عمران/۹۴)

"جو لوگ اس کے بعد خدا پر جھوٹی تہمت لگائیں تو وہ ظالم و ستمگر ہیں"

ج ۔ اسلام اور قرآن کے دشمن وحی الٰہی کی تحقیر کرنے کے لئے اس کی طرف شعر، جادو، اساطیر (قصے بے بنیاد افسانے اور اضغاث واحلام (آشفتہ و بے معنی افکار و خیالات) کی نسبت دیتے تھے تاکہ بزعم خود اسے مبتذل قرار دے کر اس عالی اور جامع اسلامی تہذیب کے رواج میں رکاوٹ پیدا کریں۔ نمونہ کے طور پر سورۂ فرقان کی چوتھی آیت میں ارشاد ہے:۔

"وقال الذين كفروا ان هذا الا افك افتراه واعانه عليه قوم آخرون"

کافروں نے کہا: یہ قرآن تو نرا جھوٹ ہے جسے اس (رسولؐ) نے اپنی طرف سے گڑھ لیا ہے اور کچھ اہل کتاب نے اسے گڑھنے میں اس کی مدد بھی کی ہے اور اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہے:۔

وقالوا اساطير الاولين اكتتبها فهي تملىٰ عليه بكرة واصيلا[1] (فرقان/۵)

اور کہنے لگے کہ یہ (قرآن) پرانے لوگوں کے افسانے ہیں جنہیں وہ شب و روز (رسولؐ) کو املاء کیا کرتے تھے[2]۔

---

[1] اس کے علاوہ اس سلسلہ میں سورۂ انفال/ ۳۰، سورۂ انعام/ ۲۵، سورۂ نحل/ ۲۴ سورۂ قلم/ ۱۵، سورۂ مطففین/ ۱۳، سورۂ سبا/ ۴، سورۂ زخرف/ ۳۰، سورۂ مدثر/ ۲۵ و ۳۰، سورۂ الحاقہ/ ۴۱ اور سورۂ یٰس/ ۶۹ آیتیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

[2] مبارزۂ طاغوتیان با قرآن، از استاد علی کریمی جہرمی، ص۵۵ اور اس کے بعد۔

ایک اور تہمت جو قرآن سے منسوب کی گئی اس کی طرف تحریف کی نسبت ہے، اس سلسلہ میں ہمارے ایک استاد محترم فرماتے ہیں :-

اس نظریہ کے وجود اور اس کی پیدائش کو اگرچہ ہم ــــ اس حکم کے تحت کہ یہ کام ان دو تین بزرگ علماء کا تھا جن کا پاکیزہ دامن دین سے خود غرضی کے الزام سے آلودہ نہیں ہوتا بلکہ وہ چند ضعیف روایات پر اعتماد کر کے اس نظریہ کی طرف مائل ہوئے ہیں ــــ دشمن اسلام و قرآن کی راہ کی حیثیت سے توجیہ و تغییر نہ کریں لیکن بلا شبہ اس کی ترویج و اشاعت، خاص طور سے اس نظریہ کے تحت دیئے جانے والے قاطع اور کافی جوابوں کو دیکھتے ہوئے بذات خود استعمار سے مربوط ہے۔ کیونکہ اس نظریہ کے رواج کا سب سے بڑا نتیجہ و ثمرہ یہ ہے کہ یہ نظریہ اسلامی معاشروں سے قرآن پر اعتماد کو سلب کرتا ہے جب لوگ قرآن یعنی عظیم ترین علمی، تہذیبی، دینی اور قانونی سرچشمہ کو تحریف شدہ اور متغیر خیال کریں گے پھر اس کی کس آیت، قانون اور دستور پر بھروسہ و اعتماد کر سکتے ہیں اور کس طرح اسلامی اصول اور دینی اعتقاد کے پابند رہ سکتے ہیں، ساتھ ہی ایک مسلمان مختلف معاشروں میں کس طرح اپنے وجود کا اظہار کر سکتا ہے اور دوسروں کو اسلام کی دعوت دے سکتا ہے اور لوگ اسلام کی طرف بلانے والوں کی دعوت کو کیونکر قبول کریں گے۔

جی ہاں ! یہ بھی عیسائیوں کے جرائم میں سے ہے کہ اپنے شیطانی مقاصد اور گھناؤنے اغراض یعنی اسلام و قرآن کو رسوا اور گمنام کرنے کے لئے کسی بھی طرح کی تہمت و بدگوئی جھوٹے پروپیگنڈوں اور جعل و فریب میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ کیا انہوں نے پیغمبر اسلامؐ جیسی اعلیٰ و باعظمت شخصیت پر دسیوں بزدلانہ تہمتیں نہیں لگائیں۔ یہ بھی ان کے جھوٹ کی پوٹ اور منحوس جعلیات میں سے ہے کہ قرآن کو انسانی معاشروں

ؔ مرحوم علامہ شہید قاضی تبریزی کتاب "الانوار النعمانیۃ" ج ۲ ص ۳۶۲ کے حاشیہ پر تحریف قرآن کے موضوع پر محدث نوری کی کتاب "فصل الخطاب" کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں: "کہا جاتا ہے کہ بعض دین و مذہب کے دشمنوں نے ان کو اس کتاب کی تالیف پر ابھارا اور خود ان کے باطل ارادوں کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: اس کتاب کے سلسلہ میں شیخ الشریعہ اصفہانی کا رد عمل ہمارے خیال کی مکمل تائید کرتا ہے۔ شیخ الشریعہ کے بعض شاگردوں نے کہا ہے کہ: جب بھی اس عظیم محقق کی نگاہ کتاب "فصل الخطاب" پر پڑتی تھی فرماتے تھے: کاش اس کے مؤلف کا قلم ٹوٹ جاتا اور یہ کتاب تالیف نہ ہو پاتی۔"

کی نگاہ سے گرانے اور مسلمانوں کے دلوں نیز ان کے خیالات کو قرآن سے پھیرنے نیز قرآن اور مسلمانوں کے درمیان شگاف پیدا کرنے کے لئے اس طرح کی تہمتوں اور ناروا الزامات کا سہارا لیتے ہیں۔

استعماری عوامل نے اسلام کو نابود کرنے کے لئے جعل و فریب جھوٹ اور تہمت سے اس قدر کام لیا ہے اور اس پر اس طرح حملہ آور ہوئے ہیں کہ کسی دین کے مخالف اس دین پر یوں حملہ آور نہیں ہوئے وہ روشن و تابناک کتاب جو حضرت محمد صلی اللہ وآلہ کا دائمی و ابدی معجزہ ہے، اسے تغیر یافتہ اور کم و بیش شدہ ظاہر کرتے ہیں تاکہ اس طرح حضرت محمدؐ کی شخصیت ان کے مکتب فکر، اسلام اور آنحضرتؐ کی امت کو نابود کر دیں، ورنہ بذات خود یہ نظریہ کوئی قابل توجہ مآخذ نہیں رکھتا، اور چند ضعیف روایتوں کے علاوہ کوئی اور چیز اس کی تائید نہیں کرتی اور مزید یہ کہ خود ان روایات میں بھی بحث ہے کہ کہاں سے وجود میں آئیں اور کوئی ٹھیک نہیں ہے کہ یہی روایتیں استعمار اور عیسائیوں کے ذریعہ جعل ہوئی ہوں جیسا کہ عالم عارف آقا شیخ عباس تہرانی قدس سرہ نے فرمایا ہے:-

"پورے اطمینان سے کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی روایتیں یہود و نصاریٰ کی ساختہ و پرداختہ ہیں کہ انہوں نے اسلام کی خیرہ کرنے والی عظمت اور مسلمانوں کی عالمی قوت و طاقت کا مشاہدہ کرنے کے بعد اسلام سے ٹکر لینے کی اس سے بہتر کوئی اور راہ نہ پائی کہ ظاہری طور پر مسلمان ہو جائیں اور اس راہ سے اپنے اسلام مخالف مقاصد پر عمل کریں ایک اہم کام جو انہوں نے اختلاف و تفرقہ پیدا کرنے کے لئے انجام دیا وہ یہی تھا کہ مختلف موضوعات خاص طور سے قرآن کریم ــ جو اسلام کا منبع اور مسلمانوں کا مرکز حیات ہے ــ کی تحریف کے سلسلہ میں روایتیں گڑھیں اور مسلمانوں کے درمیان شائع کردیں ان زہریلے مواد کو اسلام کے جسم میں داخل کرنے سے ان کا مقصد یہ تھا اور اب بھی ہے کہ جس طرح ان کی توریت و انجیل تحریف کا شکار ہو کر ناقابل اعتبار ہو گئی ہیں یوں ہی قرآن پر بھی تحریف کی تہمت لگائیں تاکہ اپنے خیال میں اسے بھی ناقابل اعتبار بنا دیں۔[1] بہت سے علماء اور صاحبان قلم نے اس مسئلہ کا جواب دیا ہے جنھیں ہم حسب ذیل ذکر کرتے ہیں:-

"تفسیر تبیان" از شیخ طوسی، "تفسیر مجمع البیان" از امین الاسلام طبرسی، ج ۱ ص ۱۵، اعتقادات شیخ صدوق "تفسیر صافی" ج ۱/ ص ۱۱، "برہان روشن" از میرزا مہدی بروجردی "آلاء الرحمٰن فی الرد

[1] دین و وجدان، ص ۳۲۵

علی التحریف" از عبدالرحیم تبریزی ، " النقد اللطیف فی نفی التحریف" از شیخ آقا بزرگ تہرانی ،
سعد السعود ص۱۴۴ - ۱۴۵ ، ۱۹۲ - ۱۹۳ ، مبارزہ طاغوتیان با قرآن از ص۶ اور اس کے بعد ، اکذوبۃ
تحریف القرآن از رسول جعفریان (قارئین مجلہ توحید کے گزشتہ شماروں میں اس کا ترجمہ ملاحظ فرمائیں) ،
الغدیر ج ۳/ ص۱۰۱ ، شناخت قرآن از جناب نجمی و جناب ہریسی از ص۱۱۴ تا ۲۲۳ ، مقدمہ تفسیر البیان ،
از آقای خوئی (اس کا ترجمہ شناخت تحریف از جناب تقی الحیدری ہندوستان میں چھپ چکا ہے) ، الارشادات
فی عدم تحریف الکتاب از محمد ابراھیم اصفہانی معروف بہ کلباسی ، افسانہ تحریف از مہدوی ، تنزیہ التنزیل
از سید ھبۃ الدین شہرستانی (اس کا فارسی ترجمہ بھی موجود ہے) ، رسالہ شریفہ فی حفظ الکتاب
الشریف عن شبہۃ القول بالتحریف از میرزا محمد حسین شہرستانی حائری متوفی ۱۳۱۵ ھ
کشف الارتیاب عن تحریف کتاب رب الارباب از شیخ محمود معروف بہ معرب
(مذکورہ بالا دونوں کتابیں کتاب "فصل الخطاب" کے جواب میں لکھی گئی ہیں)
التحقیق فی نفی التحریف عن القرآن الشریف از سید علی میلانی دار القرآن الکریم - قم
صیانۃ القرآن من التحریف از محمد ہادی دار القرآن الکریم - قم

محمد محمد المدنی مشہور مصری دانشور اور الازہر یونیورسٹی کے شریعت کالج کے انچارج اور مجلہ
"رسالۃ الاسلام" کے مدیر اعلیٰ مذکورہ مجلہ کے گیارھویں سال کے چالیسویں شمارہ میں جامعہ الازہر کے
سربراہ شیخ محمد شلتوت کے شیعہ امامیہ مذہب کی پیروی سے متعلق تاریخی فتوے کی روشنی میں "ایک
اسلامی مذہب" کے عنوان سے مقالہ تحریر کرتے ہیں اور اس میں شیعہ امامیہ عقائد کا دفاع کرتے ہوئے
لکھتے ہیں :-

"اب رہی شیعہ امامیہ کی طرف تحریف قرآن کی نسبت تو یہ کہنا پڑے گا کہ امامیہ نقص و تحریف
قرآن کے ہرگز قائل نہیں ہیں ۔ ہاں اس بارے میں ان کی کتابوں میں روایتیں ملتی ہیں بالکل
یوں ہی جیسے ہماری کتابوں میں بھی اس طرح کی روایتیں موجود ہیں ۔
لیکن شیعہ و سنی محقق علماء نے ان روایات کے باطل ہونے کو واضح کیا ہے ۔ شیعہ امامیہ
اور زیدیہ میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ان روایات پر اعتقاد رکھتا ہو جس طرح سے سنیوں
کے درمیان بھی کوئی اس موضوع کا معتقد نہیں ہے ۔ جو شخص اہل سنت کی کتابوں میں

اس طرح کی روایات کے بارے میں جاننا چاہتا ہے وہ کتاب "اتقان سیوطی" کی طرف رجوع کرے۔[1]

ایک مصری نے ۱۹۴۸ء میں "فرقان" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی ہے اور اس نے تحریف قرآن کے موضوع پر سنّی مدارک سے بہت سی روایتیں اپنی کتاب میں جمع کی ہیں۔ یہ روایتیں ضعیف ہیں اور اعتماد کے قابل نہیں ہیں۔ پھر کیا ہم اہل سنت اگر یہ دیکھیں کہ ایک سنّی نے تحریف قرآن کے موضوع پر کتاب تالیف کی یا روایت نقل کی ہے تو کیا ہم مجموعی طور سے تمام سنیوں کی طرف یہ نسبت دے سکتے ہیں کہ سنی نقص و تحریف قرآن کے قائل ہیں؟ ہرگز نہیں! علامۂ بزرگوار فضل بن حسن طبرسی جو چھٹی صدی ہجری کے عظیم امامیہ علماء میں سے ہیں، اپنی کتاب "مجمع البیان" میں تحریف قرآن سے متعلق روایات کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"ہمارے بعض افراد اور کثر سنیوں کی ایک جماعت نے یہ گمان کیا ہے کہ قرآن میں نقص و تحریف ہوئی ہے لیکن ہمارے علماء کا یہ نظریہ ہرگز نہیں ہے، چنانچہ سید مرتضیٰ نے اس سلسلہ میں تفصیل سے تحقیق کی ہے۔۔۔۔"[2]

"د" - عزیز مصر کی زوجہ زلیخا نے حضرت یوسفؑ سے اپنے عشق کی دردناک شکست کے بعد ان پر دست درازی کا الزام لگایا۔ فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ سات طرح کے لوگوں نے جناب یوسفؑ پر وارد ہونے والی اس تہمت سے ان کے بری ہونے کی گواہی دی ہے جو حسب ذیل ہیں:-

۱- خود حضرت یوسفؑ جو فرماتے ہیں: ھی راودتنی عن نفسی (یوسف/۲۶) اس نے خود مجھ سے میری آرزو کی تھی۔ اور پھر فرماتے ہیں: رب السجن احب الی مما تدعوننی الیہ (آیت/ ۳۳)۔ "میرے پالنے والے! یہ عورتیں مجھ سے جس بات کی خواہش کر رہی ہیں اس سے مجھے قید خانہ زیادہ پسند ہے۔"

۲- عزیز مصر کی زوجہ (راعیل، معروف بہ زلیخا) جس نے کہا: "و لقد راودتہ عن نفسہ فاستعصم" "قالت... الآن حصحص الحق انا راودتہ عن نفسہ" (آیت/ ۳۲ و ۵۱) ہاں بلاشبہ

---

[1] نیز اس کتاب کے جزو دوم کا صـ ۳۰ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

[2] مجلہ مکتب اسلام شمارہ ۶، سال دوم صـ ۴۶، مفاخر اسلام ج ۳/ ۲۴-۳۰

میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنا چاہا لیکن "وہ بچا رہا اور پھر اس نے کہا اب حق بات سب پر کھل گئی ہے، میں نے خود اس سے اپنا مطلب حاصل کرنا چاہا تھا۔

۳۔ مصر کی عورتیں، جن کی گواہی قرآن میں یوں ذکر ہوئی ہے: امرأة العزیز تراود فتیٰها عن نفسه قد شغفها حبا انا لنراها فی ضلل مبین (آیت/ ۳۰) عزیز مصر کی بیوی اپنے غلام سے (ناجائز) مطلب حاصل کرنے کی آرزومند ہے۔ غلام نے اسے الفت میں لبھا لیا ہے یقیناً ہم لوگ اسے کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔

۴۔ عزیز مصر، کہ قرآن اس کی زبانی فرماتا ہے: انه من کیدکن ان کیدکن عظیم (آیت ۲۸) یقیناً یہ تم لوگوں کا مکر ہے اور بلاشبہ تم لوگوں کا مکر بہت غضب کا ہوتا ہے۔

۵۔ عزیز مصر کے دربار کے گواہ، قرآن کی زبانی: وشهد شاهد من اهلها (آیت/ ۲۶) زلیخا کے خاندان والوں میں سے ایک نے گواہی دی۔

۶۔ پروردگار عالم کی گواہی کہ ارشاد ہوتا ہے: کذلک لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصین " (آیت/ ۲۴) (ہم نے اس کو یوں بچایا) "تاکہ اس سے برائی اور بدکاری کو دور رکھیں بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔

۷۔ خداوند عالم کے مخلص بندوں کو گمراہ کرنے سے شیطان کا عاجزانہ اقرار، قرآن کریم اس کی زبانی ارشاد فرماتا ہے: فبعزتک لاغوینهم اجمعین الا عبادک منهم المخلصین " تیری عزت کی قسم میں تمام لوگوں کو گمراہ کروں گا، سوائے ان افراد کے جو تیرے مخلص بندے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں مذکورہ بالا آیت میں خداوند عالم نے حضرت یوسفؑ کی " انه من عبادنا المخلصین " کے عنوان سے تعریف کی ہے۔

لیکن ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ ج ا ص ۲۲۹-۲۳۷ حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں ایسی خرافات اور بیہودہ باتیں کہی ہیں جن کی رکاکت کے سبب ہم ان کے ذکر سے پرہیز کرتے ہیں۔

س ۲: قارون نے جناب موسیٰ کو رسوا اور بدنام کرنے کے لئے ایک فاحشہ و بدکار عورت کی خدمات حاصل کیں اور اسے آمادہ کیا کہ جب موسیٰؑ لوگوں کی نصیحت و ہدایت میں مشغول ہوں اس وقت لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر ان پر بدکاری کا الزام لگائے۔ قرآن اس سلسلہ میں فرماتا ہے:-

"یا ایھا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین آذوا موسیٰ فبرأہ اللہ مما قالوا وکان عند اللہ وجیھاً" (احزاب/۶۹)

اے ایمان والو! خبردار تم بھی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنھوں نے موسیٰ کو اذیت پہنچائی تو خدا نے ان کی تہمتوں سے موسیٰؑ کو بری کر دیا اور وہ خدا کے نزدیک باوجیہ پیغمبر تھے۔

قارون کے علاوہ بنی اسرائیل بھی جناب موسیٰؑ پر مختلف تہمتیں لگانے میں پیچھے نہ رہے۔ وہ آپ کو کبھی عنین کنکہ نامردی کی تہمت لگاتے تھے اور چونکہ جناب موسیٰؑ لوگوں کے سامنے غسل نہیں فرماتے تھے لہذا انھیں جسمانی امراض سے متہم کرتے تھے اور کبھی انھیں اپنے بھائی ہارون کا قاتل کہتے تھے، یہاں تک کہ خداوند عالم نے غسل کے وقت ان کے جسم کو ظاہر کر دیا اور ہارونؑ کو موت کے بعد زندہ کیا انھوں نے اپنی طبیعی موت کا اقرار کیا۔ اس طرح خداوند عالم نے اپنے پیغمبر کو ان تہمتوں سے نجات عطا فرمائی۔[۱]

س: یہودی اور عیسائی دونوں توحید کے عظیم علمبردار جناب ابراہیم کو اپنے دین کے تابع سمجھتے۔ اور ان پر یہودی یا عیسائی ہونے کی تہمت لگاتے تھے۔ خدا نے ان دونوں کے جھوٹے دعووں پر تکذیب کی مہر لگا دی اور فرمایا:۔

ماکان ابراھیم یھودیاً ولا نصرانیاً ولکن کان حنیفاً مسلماً (آل عمران/۶۷)

ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ وہ سیدھے راستہ پر چلنے والے مسلم (فرمانبردار) بندے تھے اہل سنت کے مشہور مورخ طبری نے بھی ابوالانبیاء جناب ابراہیمؑ پر جھوٹ بولنے کی تہمت روا رکھی ہے اور اپنی تاریخ ج ۱ ص ۱۲۳ پر لکھتا ہے: "ابراہیمؑ تین مقام پر جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوئے ہیں"!

ص: ۔ شیخ الانبیاء حضرت نوحؑ جنھوں نے نو سو پچاس سال تک اپنی قوم میں ہدایت کا فریضہ انجام دیا، انھیں دیوانہ کہا گیا، خداوند عالم نے ایک آیت کے ذریعہ اس تہمت کو جناب نوحؑ کے دامن سے پاک کیا اور فرمایا:۔

کذبت قبلھم قوم نوح فکذبوا عبدنا وقالوا مجنون وازدجر (القمر/۹)

ان سے پہلے نوح کی قوم نے بھی جھٹلایا تھا پس انھوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا کہ یہ دیوانہ ہے اور انھیں جھڑکیاں بھی دی گئیں۔

---

[۱] روان جاوید ج ۴ ص ۳۴۳، کشف الاسرار وعدۃ الابرار ج ۶ ص ۶۲-۶۱

جناب نوحؑ کی قوم کے اشراف اور بڑے لوگوں نے ان کی آسمانی دعوت کو جھٹلایا اور ان پر گمراہی کا الزام لگایا:۔

قال الملاء من قومہ انا لنراك فی ضلال مبین (اعراف/۶۰)

بلا شبہ اپنی قوم کے درمیان جناب نوحؑ کی ہدایت و دعوت کی راہ میں اس قدر ستی کہ سالہا سال کے بعد گنتی کے چند لوگ آپ کے دین پر ایمان لائے، اس کا سبب ان کے خلاف ہی ماحول اور ناروا تہمتیں تھیں جو قوم کے سرکردہ افراد کی طرف سے ان پر لگائی جاتی تھیں۔

ط۔ اسی طرح جناب ہودؑ کی قوم کے رؤسا اور اونچے طبقہ کے لوگ جو ان کی رسالت کے منکر تھے ان پر بے عقلی اور جھوٹ بولنے کا الزام لگاتے تھے:۔

قال الملاء الذین کفروا من قومہ انا لنراك فی سفاھۃ وانا لنظنك من الکاذبین (اعراف/۶۶)

"ع"۔ خدا کی طرف سے معین شدہ مصائب و ابتلاء کے مقابل جناب ایوبؑ کا صبر و تحمل تاریخ میں مشہور ہے لیکن ان کے بعض ماننے والوں نے ان پر خدا کی نافرمانی اور اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کا الزام لگایا خداوند عالم نے انھیں اس تہمت سے نجات عطا فرمائی اور اپنی نعمتیں دوبارہ ان پہ نازل فرمائیں۔

علامۂ جلیل سید مرتضیٰ علم الھدیٰ نے کتاب "تنزیہ الانبیاء" میں دشمنان خدا کی طرف انبیاء پر وارد ہونے والی ناروا تہمتوں کو رد کیا ہے اور جناب ایوبؑ کے بارہ میں تحریر فرماتے ہیں: بعض مفسرین کی طرف سے ان کے بارہ میں جو روایت کی گئی ہے اس پر کان نہیں دھرنا چاہئے کیونکہ یہ لوگ عمتہ خدا اور ان کے پیغمبروں پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے ہیں اور ہر خطا ان کے لئے ثابت کرتے ہیں۔ انہوں نے جناب ایوبؑ کے بارہ میں ایسی باتیں روایت کی ہیں کہ اک ذرا سی توجہ سے ان کا جعلی ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ تہمتیں جو مخالفین انبیاء نے جنہیں قرآن: مترف، ملاء، جبّار وغیرہ جیسے عنوانات سے یاد کرتا ہے، انبیاء پر وارد کی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور سحر و جنون یعنی جادوگر اور دیوانہ کی تہمت ہے۔ اکثر و بیشتر انبیاء اس کا نشانہ بنے ہیں چنانچہ قرآن کریم اس

میں فرماتا ہے :-

کذالک ما اتی الذین من قبلھم من رسول الا قالوا ساحر او مجنون (الذاریات / ۵۲)

یعنی : اسی طرح ان سے پہلے کے لوگوں کے پاس جب بھی کوئی رسول آتا تو وہ اسے یا جادوگر کہتے یا دیوانہ۔

انبیاء کرام کی پاکیزہ و مقدس ذات پر اس طرح کے اتہامات لگانے سے مخالفین کا مقصد لوگوں کے دلوں میں ان کے گہرے اثر و رسوخ کو روکنا تھا کہ معمولاً صحیح و پائدار باتوں اور چھوڑنے والے معجزات کے مقابل انھیں تہمت لگانے کے علاوہ کوئی اور راہ نظر نہ آتی تھی۔

ف - یہاں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ اور ان کی اولاد طاہرہ علیہم السلام سے متعلق ایک تاریخی نمونہ ملاحظہ فرمائیں :-[1]

روایت ہے کہ معاویہ شام کے چھوٹے بچوں کو بکری کے بچے ہدیہ کرتا تھا اور جب وہ بچے بکری کے ان بچوں سے پوری طرح ہل مل جاتے تو انھیں چرا لینے کا حکم دیتا تھا۔ جب لڑکے بکری کے بچوں کو نہ پاتے تو پورے غم و اضطراب کے ساتھ اپنے ماں باپ اور دوسروں سے پوچھتے تھے میرا بکری کا بچہ کیا ہوا ؟ اس وقت ان سے کہا جاتا تھا، علیؑ نے (معاذ اللہ) انھیں چرا لیا ہے۔ اس دردناک تہمت کے ذریعہ حضرتؑ کی دشمنی و عداوت کا بیج شام کے نونہالوں کے دلوں میں بویا جاتا تھا۔

اور خوارج نے جو سادہ لوح، فریب خوردہ اور مقدس نما جاہلوں کا گروہ تھا اور جن میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں کی تعداد بھی موجود تھی، تاریخ اسلام کے سب سے پہلے مسلمان حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب اور ان کے طرفداروں اور شیعوں پر کفر کی تہمت لگائی۔[2]

---

[1] اس طرح تہمت کی دوسری مثالیں مثلاً حضرت علی علیہ السلام کا حضرت فاطمہ علیہا السلام کی حیات میں ابوجہل کی بیٹی سے شادی کرنا اور پیغمبر کا مخالفت کرنا نقل کرتے ہیں کہ کتاب "مسکینہ" دختر امام حسینؑ" از علی محمد علی دخیل صفحہ ۱۰۱-۱۱۹ پر ان کا جواب بھی مذکور ہے۔

[1] رک۔ الغدیر، ج ۳ صفحہ ۲۶ اور اس کے بعد [2] خوارج، نہج البلاغہ کی روشنی میں، ج ۱، ص ۱۳۴

یہ خیانت آمیز کوششیں اگرچہ ایک خاص زمانہ تک کارگر رہیں لیکن آخر کار آفتاب امامت کی کرنوں کو روک نہ پائیں اور حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کی حقانیت نیز ان کی فکری روش یعنی صراط مستقیم اور لقاء اللہ کو ہمیشہ کے لئے تہمت و خیانت کے بادلوں میں چھپا نہ پائیں۔

ل۔ شیعوں کے دوسرے امام اور فرزند رسول خدا حضرت حسن بن علی علیہما السلام پر بھی کثرت ازدواج اور طلاق کے سلسلہ میں اتہام لگائے گئے کہ علماء و صاحبان قلم نے ان کے بھرپور جواب دیئے ہیں منجملہ ان کے مشہور اہل قلم باقر شریف القرشی نے اپنی قابل قدر کتاب "حیات الحسن" و معروف الحسنی در "سیرۃ الائمۃ الاثنی عشر" میں اس تہمت کے دنداں شکن جوابات دیئے ہیں۔

ہشام بن ابراہیم عباسی جو فضل بن سہل کی طرف سے امام رضا علیہ السلام کی نگرانی پر مامور تھا، اس نے لوگوں میں یہ افواہ پھیلا رکھی تھی کہ حضرتؑ غناء کو حلال جانتے ہیں۔ جب خود امامؑ سے اس سلسلہ میں سوال کیا گیا تو حضرتؑ نے فرمایا: "یہ کافر جھوٹ بولتا ہے۔" یہ افواہ مامون کے حکم سے امام رضاؑ کو (معاذ اللہ) ذلیل کرنے کے لئے لوگوں میں پھیلائی جاتی تھی۔

محمد بن نصیر نمیری ایک فاسد و منحرف شخص تھا اس نے پیغمبری کا دعویٰ کر رکھا تھا اور خود کو امام علی نقیؑ کی طرف سے جن کو اس نے خدا مشہور کر رکھا تھا، مبعوث جانتا تھا۔ "سبحانک ھذا بھتان عظیم" (نور/۱٦) "سبحان اللہ! یہ بہت عظیم بہتان ہے۔"

امام علی نقیؑ کے ایک دشمن نے متوکل کی خوشنودی کے لئے حضرت پر تہمت لگائی، حضرت جو کئی مرتبہ متوکل کے حکم سے اس کے یہاں لائے گئے تھے، جب نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو اس شخص نے آپ پر ریاکاری کی تہمت لگائی۔ امامؑ نے نماز تمام کرنے کے بعد اس کی طرف رخ کر کے فرمایا:۔ یہ تہمت جو تو نے مجھ پر لگائی ہے اگر جھوٹ ہے تو خدا تجھے ہلاک کر دے اور وہ فوراً اسی جگہ ہلاک ہو گیا۔

بعض مفسد، گمراہ اور شہرت طلب افراد کا گروہ منجملہ ان کے ابو محمد حسن شریعی، محمد بن نصیر نمیری احمد بن ہلال کرخی، محمد بن علی بن بلال، حسین بن منصور حلاج، ابن ابی العزاقر (محمد بن علی شلمغانی) اور میرزا مہر علی محمد شیرازی ان گمراہ لوگوں میں سے تھے جنھوں نے عوام کی سادگی اور عدم تشخیص سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے بابیت اور امام زمانہؑ کی نیابت کا دعویٰ کیا ان میں سے ہر ایک نے اپنی

کوششوں اور حالات کے مطابق اپنے پیرو بھی اکٹھا کر لئے تھے۔ علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الانوار کی ۱۳ ویں جلد میں ان میں سے بعض کے نام ذکر کئے ہیں۔ نیز اس کے ترجمہ (مہدی موعود) ص ۵۱۷ تا ص ۵۳۹ و مفتاح باب الابواب' باب نہم میں زیر عنوان "وہ مسلمان جنہوں نے مہدویت اور عیسویت کا دعویٰ کیا" ان کا ذکر کیا ہے جن کی تعداد پچاس نفر تک پہنچتی ہے اور ص ۴۶ سے ص ۴۷ تک ان میں سے بعض کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ "محاکمہ و بررسی باب و بہاء ج ا ص ۳۱ و ص ۳۲ اور "الامام المہدیؑ من المہد الی الظہور" در فصل ۱۷ میں زیر عنوان "الذین ادّعوا المہدویۃ کذباً و زوراً او نسبت الیہم" انہیں تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے ص ۴۴۸ تا ص ۴۶۲۔ نیز کتاب "طبقات المضلّین" اور کتاب "مہدی انقلابی بزرگ" میں ص ۳۲۷ سے "مدعیان دروغین" کے عنوان کے تحت نیز کتاب "کشف الستر وجہ الغیبۃ" ص ۹۵ اور "ادیان و مہدویت" ملاحظہ فرمائیں۔

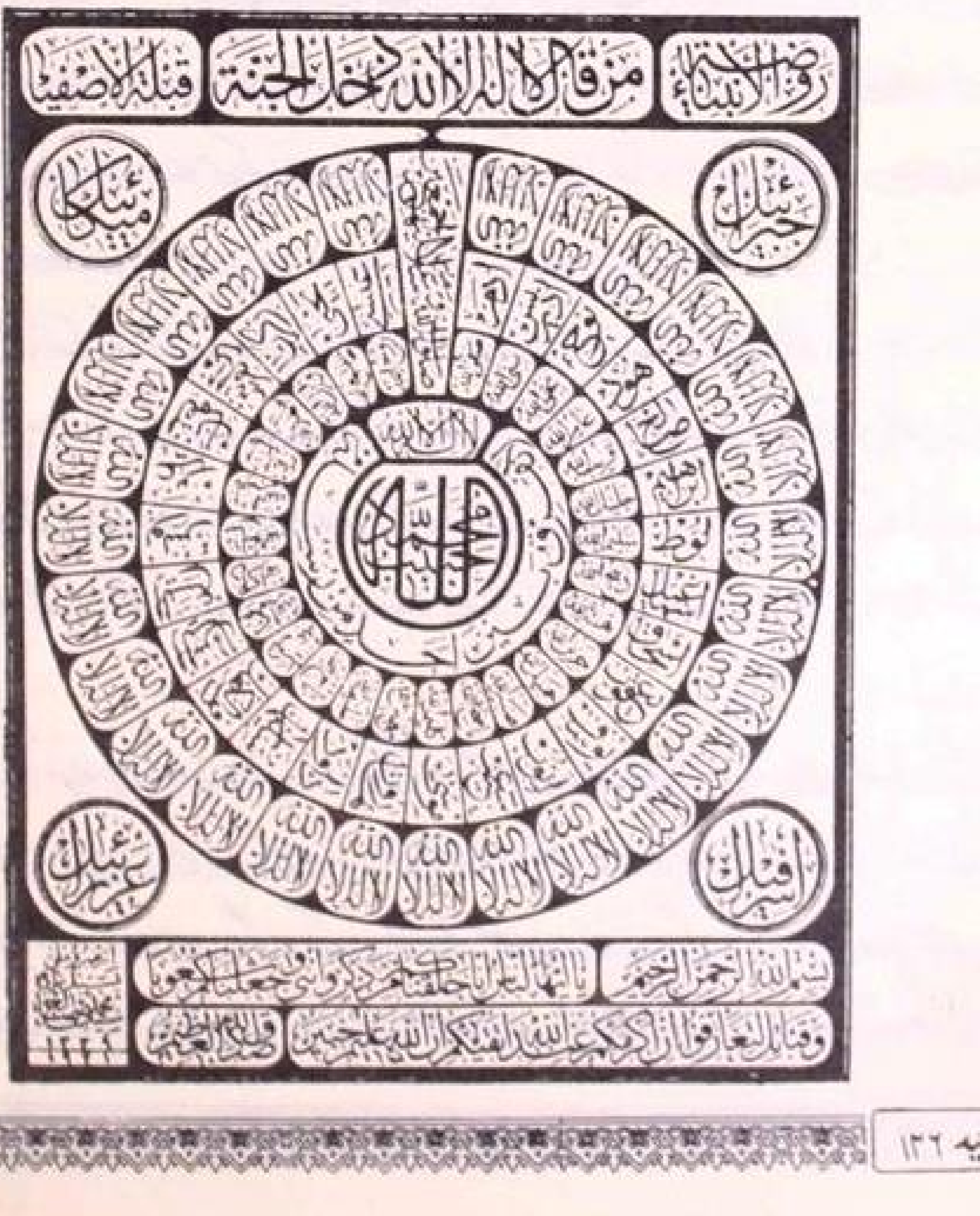

رسول اسلام

روایات کے آئینہ میں

علامہ طباطبائی طاب ثراہ

ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

غسل کے آداب

تہذیب الاحکام میں معاویہ ابن عمار سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو کہتے ہوئے سنا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک صاع (تقریباً تین کلو) پانی سے غسل فرماتے تھے۔ اور اگر ان کے ساتھ ان کی ازواج میں سے کوئی ہوتا تو ایک صاع اور ایک مد (تقریباً تین پاؤ) پانی سے وہ دونوں غسل کر لیتے تھے[1]۔

اس بات کو جناب کلینی نے بھی اپنی اسناد کے ساتھ محمد ابن مسلم کے ذریعہ امام صادقؑ سے نقل کیا ہے کلینی کی روایت میں بس اتنا فرق ہے کہ دونوں ایک ہی ظرف سے غسل کرتے تھے[2]۔ اسی طرح شیخ نے بھی دوسرے سلسلوں سے یہ روایت نقل کی ہے۔

جعفریات میں اپنی سند کے ساتھ امام جعفر ابن محمد باقر علیہما السلام نے اپنے پدر بزرگوار سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: حسن ابن محمد نے جابر ابن عبد اللہ سے رسول اسلامؐ کے غسل کے طریقے سے متعلق سوال کیا تو جابر نے فرمایا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلو سے تین مرتبہ اپنے سر

---

[1] تہذیب ج ۱ ص ۱۳۷ حدیث ۷۴

[2] کافی ج ۳ ص ۲۲ حدیث ۵

پانی ڈالتے تھے، حسن ابن محمد نے سوال کیا: میرا بال جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو زیادہ اور گھنا ہے (کیا اسی طرح رسول اسلامؐ کا بھی تھا) جابر نے کہا: اے عقلمند! ایسی بات نہ کہہ اس لئے کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بال تیرے بال سے زیادہ لمبے اور پاکیزہ تھے۔[1]

شیخ صدوق نے اپنی کتاب "ھدایہ" میں لکھا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جمعہ کا غسل وہ سنت ہے جو مرد و عورت پر گھر میں یا سفر میں ضروری ہے، یہاں تک کہ وہ کہتے ہیں کہ امام صادق نے یہ بھی فرمایا کہ: جمعہ کا غسل بدن کی صفائی کا ذریعہ بھی ہے اور دو جمعوں کے درمیان سرزد ہونے والے گناہوں کا کفارہ بھی ہے، اس کے بعد فرمایا: غسل جمعہ کی علت یہ تھی کہ انصار ہفتہ کے ایام میں اونٹوں کی نگہبانی نیز اپنے تمام اموال کی دیکھ بھال میں لگے رہتے تھے جب جمعہ کا دن آتا تھا تو اسی کثیف جسم کے ساتھ مسجد میں چلے آتے تھے اور رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان کے زیر بغل سے چھوٹنے والی بدبو سے تکلیف ہوتی تھی اسی وجہ سے آپ نے حکم دیا کہ جمعہ کے دن سب غسل کریں اور یہ بات خود باعث بنی کہ غسل جمعہ سنت ہو۔"[2]

روایت کے مطابق آداب غسل میں رسول اسلامؐ کی سنتوں میں سے غسل عید فطر اور تمام عیدوں کے غسل بھی ہیں اور دوسرے بھی بہت سے غسل ہیں کہ اگر ممکن ہو تو ہم ان میں سے بعض کی طرف آئندہ اشارہ کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

سنن و آداب نماز

کافی میں کلینی نے اپنی اسناد کے ساتھ فضیل ابن یسار، عبد الملک اور بکیر سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا، آپ نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مستحبی نمازیں اور مستحبی روزے واجبی نماز اور واجبی روزہ کی طرح انجام دیتے تھے اس بات کو شیخ نے بھی نقل کیا ہے۔[3]

کافی میں حنان سے روایت ہے کہ اس نے کہا: عمرو ابن حریث نے امام صادق علیہ السلام

---

[1] جعفریات ص ۲۲

[2] علل الشرائع ج ا ص ۲۸۰ - ماخوذ از حاشیہ سنن النبی والھدایہ صدوق ص ۲۳

[3] کافی ج ۳ ص ۴۴۳ حدیث ۳

سے جبکہ میں بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا، سوال کیا: آپ پر قربان جاؤں مجھکو رسولؐ خدا کی نماز کے بارے میں خبر دیں۔ حضرتؑ نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ۸ رکعت نافلۂ ظہر اور ۴ رکعت ظہر ۸ رکعت نافلۂ عصر اور ۴ رکعت عصر، ۳ رکعت نماز مغرب اور ۴ رکعت نافلۂ مغرب، ۴ رکعت نماز عشاء، ۸ رکعت نافلۂ شب اور ۳ رکعت وتر، دو رکعت نافلۂ فجر اور ۲ رکعت نماز فجر پڑھتے تھے میں نے عرض کیا: قربان جاؤں اگر میں اس سے زیادہ نماز پڑھ سکوں تو کیا خداوند عالم مجھ پر زیادہ نماز پڑھنے کے سلسلہ میں عذاب کرے گا؟ فرمایا، نہیں لیکن تم پر رسول اللہ کا طریقہ و سنت ترک کرنے کے سلسلہ میں عذاب کرے گا۔ [۱]

"تہذیب میں اپنی اسناد کے ساتھ زرارہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کو کہتے ہوئے سنا کہ: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وقت نہار سے زوال شمس تک کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ پس جب زوال ہو جاتا اور سایہ نصف انگشت کے برابر ہو جاتا ۸ رکعت نماز پڑھتے تھے، اور جب سایہ ایک ہاتھ کے برابر ہو جاتا تھا نماز ظہر پڑھتے تھے، نماز ظہر کے بعد دو رکعت اور نماز عصر سے قبل دو رکعت پڑھتے تھے، یہاں تک کہ سایہ دو ہاتھ کے برابر ہو جاتا اس وقت نماز عصر پڑھتے تھے، سورج غروب ہونے کے بعد مغرب اور شفق کی سرخی غائب ہونے کے بعد نماز عشا پڑھتے تھے.... عشا کا آخری وقت شب کے تہائی حصہ تک رہتا ہے، عشاء کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے یہاں تک کہ نصف شب آجاتی تھی۔ اس وقت اٹھ کر ۱۳ رکعت نماز پڑھتے تھے جس میں ایک رکعت نماز وتر اور دو رکعت نافلہ فجر ہوتی تھی، اور جب فجر طلوع ہوتی تھی اور ہوا روشن ہو جاتی تھی نماز صبح پڑھتے تھے۔ [۲]

تہذیب میں ہی اپنی اسناد کے ساتھ معاویہ ابن وہب سے روایت ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے سنا امام جعفر صادق علیہ السلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے: آنحضرتؐ (وقت خواب) پانی کا برتن ڈھانک دیتے تھے اور اپنی مسواک اپنے بستر کے نیچے رکھ کے جب تک خدا چاہتا تھا، سوتے تھے، اور جب خواب سے بیدار ہوتے اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے پھر آسمان کی طرف نگاہ کرتے تھے اور سورۂ آل عمران کی یہ آیت تلاوت فرماتے

---

[۱] کافی جلد ۳ ص ۴۴۳ حدیث ۵

[۲] تہذیب ج ۲ ص ۲۶۲ حدیث ۸۲

تھے: "ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنہار . . . ." (آیت/١٦٤)
اس کے بعد دانتوں میں مسواک کرتے، طہارت کرتے اور مسجد میں چلے جاتے تھے اور چار رکعت نماز پڑھتے تھے کہ جس کی ہر رکعت کا رکوع اس کی قرأت کے برابر اور سجدے رکوع کے بقدر اتنے طویل ہوتے تھے کہ لوگ کہتے تھے دیکھیں کب رکوع سے سر اٹھاتے ہیں اور سجدہ میں جاتے ہیں؟ اسی طرح سجدہ اتنا طولانی ہوتا تھا کہ لوگ کہا کرتے تھے کہ دیکھیں کب سجدہ سے سر اٹھاتا ہے؟ اس کے بعد اپنے بستر پر واپس آجاتے تھے اور جب تک خدا چاہتا سوتے تھے، پھر بیدار ہو کر بیٹھ جاتے تھے اور سورۂ آل عمران کی ان ہی آیات کی تلاوت فرماتے تھے، اور آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا لیتے تھے، پھر مسواک کرتے، طہارت کرتے اور مسجد میں چلے جاتے تھے، اور پہلی مرتبہ کی طرح اس دفعہ بھی ۴ رکعت نماز پڑھتے تھے اور اپنے بستر پر پلٹ آتے تھے اور جب تک خدا چاہتا آرام فرماتے تھے، پھر بیدار ہوتے، اٹھتے آسمان کی طرف نگاہ کرتے سورۂ آل عمران کی آیت تلاوت فرماتے، مسواک کرتے طہارت فرماتے اور مسجد میں چلے جاتے تھے، اور ایک رکعت نماز وتر اور دو رکعت دوسری نماز پڑھتے تھے اور پھر نماز صبح کے لئے برآمد ہوتے تھے۔[1]

روایت میں ہے کہ آنحضرتؐ نافلۂ صبح اول فجر کے وقت مختصر انداز میں پڑھتے اور پھر نماز صبح کے لئے برآمد ہوتے تھے۔

محاسن میں اپنی اسناد کے ساتھ عمر ابن یزید امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو شخص نماز وتر میں ستر مرتبہ استغفر اللّٰہ ربی و اتوب الیہ کہے اور اس عمل کو ایک سال تک متواتر پوری احتیاط کے ساتھ انجام دے خداوند عالم اس کا نام ان لوگوں کے زمرہ میں شامل کر دیتا ہے جو سحر کے وقت طلب مغفرت کرتے رہے ہیں، رسول خدا (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) نماز وتر میں ستر مرتبہ استغفار کرتے تھے اور سات مرتبہ کہتے تھے: "ھٰذا مقام العائذ بک من النار" (یہ اس شخص کا مقام ہے جو آتش دوزخ سے تیری پناہ میں آگیا ہے) تا آخر۔[2]

"من لایحضرہ الفقیہ" میں ہے: رسول خدا (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) نماز وتر کے قنوت میں فرماتے تھے: اللّٰھم اھدنی فیمن ھدیت وعافنی فیمن عافیت و تولنی فیمن تولیت

[1] تہذیب ج ۲ ص ۳۳۲ حدیث ۲۳۳
[2] محاسن برقی ص ۵۳ باب ۶۲ حدیث ۸۰

وبارك لی فیما اعطیت وقنی شر ما قضیت انك تقضی ولا یقضی علیك سبحانك رب البیت، استغفرك واتوب الیك واومن بك واتوکل علیك ولاحول ولاقوۃ الا بك یا رحیم"

پروردگارا! ہماری ان کے ساتھ جن کی تو نے ہدایت کی ہے ہدایت فرما اور جن کو عافیت بخشی ہے ان کے ساتھ عافیت عطا کر، اور جن کے امور تو نے خود اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں ان کے ساتھ ہمارے امور بھی اپنے ہاتھ میں لے لے، جو کچھ مجھکو دیا ہے اس میں برکت پیدا کر دے۔ مجھ کو اس قضا و قدر کے شر سے جو مقرر کئے ہیں محفوظ رکھ، کیونکہ تو ہی ہے جس کے ہاتھ میں فیصلے ہیں اور تو ہی حکم کرنے والا ہے اور کوئی تیرے خلاف حکم کرنے والا نہیں ہے۔ اے رب البیت تیری ذات ہر عیب سے منزہ ہے تجھ سے طلب مغفرت کرتا ہوں اور تیری ہی طرف رجوع کرتا ہوں، تجھ پر ایمان لاتا ہوں اور تجھ پر ہی توکل کرتا ہوں، اور کوئی طاقت و قوت نہیں ہے مگر اے خدائے مہربان جو کچھ ہے تیری ہی طرف سے ہے[1]

کتاب تہذیب میں اپنی اسناد کے ساتھ ابی خدیجہ سے اور وہ امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب بھی رمضان آتا تھا اپنی نمازوں میں اضافہ کر دیتے تھے، میں بھی اس میں اضافہ کرتا ہوں تم بھی اس ماہ میں نمازیں زیادہ پڑھا کرو۔[2] نمازیں اضافہ سے مقصد ماہ رمضان سے مخصوص ایک ہزار رکعت نافلہ کی نمازیں ہیں جو روز و شب کے نوافل کی پچاس رکعت نمازوں سے الگ ہیں، اس ہزار رکعت نماز کو رمضان المبارک کی تمام شبوں میں تقسیم کرنے کے طریقے سے متعلق بہت سی روایتیں وارد ہیں۔ اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے وسیلہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلعم یہ نمازیں جماعت کے بغیر پڑھتے تھے بلکہ یہ نماز جماعت سے ادا کرنے کو آپ نے منع فرمایا تھا آپ فرماتے تھے کہ نافلہ میں جماعت نہیں ہے، آنحضرتؐ کے لئے دوسری بھی مخصوص نمازیں ملتی ہیں جو دعا کی کتابوں میں آنحضرتؐ سے منقول ہیں، اور چونکہ ہمارے موضوع بیان سے خارج ہیں اس لئے ہم نے ان کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی ہے۔ اسی طرح آپ کی نمازوں میں مستحبات، دعائیں اور اوراد بھی ہیں، جن سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے متعلقہ کتابوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] من لا یحضرہ الفقیہ ج۱ ص ۲۰۸ حدیث

[2] تہذیب جلد ۳ ص ۶۰ حدیث ۷

کافی میں اپنی اسناد کے ساتھ یزید ابن خلیفہ سے روایت ہے وہ کہتا ہے : میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی، عمر ابن حنظلہ اوقاتِ نماز کے بارے میں ہمارے لئے آپ کی طرف سے کچھ مطالب نقل کرتے ہیں، حضرتؑ نے فرمایا : جو کچھ وہ کہتے ہیں (صحیح ہے) وہ ہم پر جھوٹ نہیں باندھتے، میں نے عرض کی، وہ کہتے ہیں : مغرب کا وقت اس وقت ہوتا ہے جب سورج چھپ جائے، یاد رہے کہ رسول خدا صلعم مسافت کے دوران جب تیزی کے ساتھ راہ طے کر رہے ہوتے تھے نماز مغرب میں تاخیر کر دیتے تھے اور اس کو نماز عشا کے ساتھ ملا کر پڑھتے تھے ۔ امامؑ نے فرمایا : عمر ابن حنظلہ نے درست کہا ہے۔[۱]

تہذیب میں اپنی اسناد کے ساتھ طلحہ ابن زید امام جعفر صادقؑ سے اور وہ اپنے پدر بزرگوار سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا : رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جن شبوں میں پانی برستا تھا نماز مغرب کو مختصر کر دیتے تھے اور عشا کے پڑھنے میں بھی عجلت سے کام لیتے تھے، اور اسے فضیلت کے وقت سے پہلے ہی مغرب کے ساتھ ملا کر پڑھا کرتے تھے اور فرماتے تھے : جو شخص عوام پر رحم نہ کرے اس کے حق میں رحم نہیں کیا جاتا۔[۲]

تہذیب میں ہی اپنی اسناد کے ساتھ ابن ابی عمیر سے اور وہ حماد سے اور وہ حلبی سے اور وہ امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا : رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ) جس وقت سفر میں ہوتے یا اسی طرح جب کوئی فوری کام ہوتا تو ظہر و عصر کو باہم ملا کر پڑھتے تھے، اور اسی طرح مغرب و عشا کے درمیان فاصلہ قرار نہیں دیتے تھے تا آخر۔[۳]

"من لا یحضرہ الفقیہ" میں اپنی اسناد کے ساتھ معاویہ ابن وھب سے اور وہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا : اکثر و بیشتر ایسا ہوتا تھا کہ ظہر کے لئے دوپہر کی گرمی میں مؤذن پیغمبر اسلامؐ کے پیچھے آتا تھا حضرتؐ فرماتے تھے "ابرد، ابرد" جلدی کرو جلدی کرو۔[۴]

کتاب احیاء العلوم میں ہے : رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نماز کے دوران کبھی یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ کوئی شخص آپ کے پاس آیا ہو یا مصلے کے کنارے بیٹھا ہو اور آپ نے اس کی خاطر نماز مختصر کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا ہو کہ : آیا کوئی حاجت رکھتے ہو؟ اور پھر اس کی حاجت کو رفع کرنے کے بعد آپ دوبارہ نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔[۵]

جعفر بن احمد قمی کی تالیف کردہ کتاب "زھد النبیؐ" میں ہے کہ رسول خدا (ص) جس وقت نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے خوف خدا سے آپ کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا تھا اور آپ کے قلب و سینہ سے ایک خائف و وحشت زدہ انسان کی مانند آوازیں سنائی دیتی تھیں۔[۶]

---

[۱] کافی جلد ۳ ص ۲۷۹ حدیث ۶ [۲] تہذیب ج ۲ ص ۳۲ ح ۴۷ [۳] تہذیب ج ۳ ص ۲۳۳ ح ۱۱۸

[۴] من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۱ ص ۱۴۴ ح ۲۶ [۵] احیاء العلوم ج ۱ ص ۱۱۳ [۶] مستدرک الوسائل ج ۱ ص ۲۶۳ ح ۴

نیز صاحب احیاء العلوم فرماتے ہیں: ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول خدا (ص) جس وقت نماز پڑھتے تھے تو ایک گوشہ میں پڑے ہوئے کسی کپڑے کی مانند ہو جاتے تھے۔[١]

بحار میں ہے کہ عائشہ کہتی ہیں: رسول خدا (ص) ہم سے اور ہم ان سے محو گفتگو ہوتے تھے لیکن جیسے ہی نماز کا وقت آتا تھا ایسی حالت ان پر طاری ہوتی تھی کہ گویا نہ وہ ہم کو پہچانتے تھے اور نہ ہم ان کو پہچانتے تھے۔[٢]

مفید الدین طوسی کتاب مجالس میں اپنی اسناد کے ساتھ جو حضرت علی (ع) پر جاکر منتہی ہوتی ہے، روایت کرتے ہیں کہ حضرت نے جس وقت محمد ابن ابی بکر کو مصر کا والی (گورنر) مقرر کیا ہے ان کو ایک دستور العمل مرحمت فرمایا تھا جس کے ضمن میں تحریر فرمایا تھا: اپنے رکوع و سجود کی طرف سے خبردار رہنا، کیونکہ رسول خدا (ص) کی نماز تمام لوگوں سے زیادہ کامل ہوتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی نماز کے اعمال (و ارکان) سب سے زیادہ سبک و مختصر ہوتے تھے۔[٣]" (یعنی طولانی نماز نہیں پڑھاتے تھے)

جعفریات میں اپنی اسناد کے ساتھ امام جعفر ابن محمد علیہما السلام اپنے آبائے طاہرین سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جس وقت بھی رسول خدا صلعم کو جماہی آتی تھی آپ اپنا داہنا ہاتھ دہن مبارک پر رکھ لیتے تھے۔[٤] کتاب دعائم میں بھی اسی قسم کی روایت نقل ہوئی ہے۔

علل الشرائع میں اپنی اسناد کے ساتھ ھشام ابن حکم سے اور انہوں نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ایک حدیث نقل کی ہے جس کے ضمن میں ہشام کہتے ہیں: میں نے حضرت کی خدمت میں عرض کی، اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم رکوع میں "سبحان ربی العظیم وبحمدہ" لیکن سجدے میں: "سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ" کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اے ہشام! جس وقت رسول خدا صلعم کو معراج کی منزلوں میں لے جایا گیا اور آپ نے وہاں نماز پڑھی اور ذکر کرنا شروع کیا، اور عظمت خداوندی کا مشاہدہ فرمایا، تو ان چیزوں کو دیکھ کر آپ کے جسم مبارک کے بند بند کانپنے لگے اور آپ بے اختیار رکوع میں جھک گئے اور اس وقت آپ کی زبان پر "سبحان ربی العظیم وبحمدہ" جاری ہوا، جب یہ کیفیت ختم ہوئی اور رکوع سے بلند ہوئے تو آپ کی نظروں نے خدائے عظیم کے اس مقام عظمت و بلندی کا مشاہدہ کیا جس سے بلند تر مقام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تو بے اختیار آپ نے اپنی پیشانی خاک پر رکھ دی اور کہا "سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ" اور اسی طرح اس ورد کی تکرار کرتے رہے یہاں تک کہ جب سات مرتبہ یہ ذکر دہرا چکے تو آپ کے دل پر جو رعب طاری تھا اس میں کچھ کمی ہوئی اسی وجہ سے آپ کی امت پر بھی یہ دونوں ذکر سنت قرار دیئے گئے۔[٥]

[١] مستدرک ج ١ ص ٢٦٢ اور حاشیہ سنن النبی کتاب زہد النبی ص ١٦١ ۔ [٢] مستدرک ج ١ ص ٢٦٤ حدیث ١٨ [٣] امالی مفید ص ١٥٦
[٤] کتاب جعفریات ص ٣٦ [٥] علل الشرائع جلد ٢ ص ٣٣٢ حدیث ٤

شیخ ورام ابن ابی فراس کی کتاب "تنبیہ الخواطر" میں نعمان سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: رسول خدا ہی ہمیشہ ہماری نماز کی صفیں اسی طرح منظم و مرتب کرتے تھے کہ اگر درمیان سے تیر رہا کیا جاتا تو اس کا فاصلہ یہاں سے وہاں تک یکساں ہوتا بعد میں رفتہ رفتہ سب اس کے عادی ہو گئے اتفاقاً ایک روز حضور صلعم مسجد میں تشریف لائے اور نماز کے لئے کھڑے ہوئے تکبیرۃ الاحرام کہنا ہی چاہتے تھے کہ متوجہ ہوئے ایک شخص کا سینہ تمام لوگوں سے آگے نکلا ہوا ہے، آپ نے فرمایا: خدا کے بندو! اپنی صفیں مرتب کرو ورنہ تمہارے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے گا۔[1]

نیز اسی کتاب میں ابن مسعود سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: رسول خدا (ص) ہمارے شانوں پر ہاتھ رکھتے اور ہم کو آگے پیچھے کر کے برابر کرتے تھے اور فرماتے تھے: منظم انداز میں کھڑے ہو ورنہ اگر کھڑے ہونے میں اختلاف ہو گا تو تمہارے دلوں میں بھی اختلاف پیدا ہو جائے گا تا آخر۔[2]

من لا یحضرہ الفقیہ میں اپنی اسناد کے ساتھ داؤد ابن حصین، ابی العباس سے اور وہ امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ ماہ رمضان کی پہلی دہائی میں معتکف ہوئے اگلے سال رمضان المبارک کی دوسری دہائی میں اعتکاف کیا لیکن اس کے بعد ہمیشہ رمضان کی آخری دہائی میں معتکف ہوا کرتے تھے۔[3]

اسی من لا یحضرہ الفقیہ میں امام صادقؑ سے ہی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جنگ بدر ماہ رمضان المبارک میں واقع ہوئی اس سال رسول خدا صلعم نے اعتکاف نہ کیا جب اگلے سال رمضان آیا تو آنحضورؐ نے دو دہائیوں میں اعتکاف کیا ایک اعتکاف اسی سال کے لئے اور ایک گزشتہ سال کی قضا کے طور پر۔[4]

کلینی نے بھی یہ روایت کافی میں نقل فرمائی ہے۔[5]

نیز کافی میں اپنی اسناد کے ساتھ حلبی نے ابی عبد اللہ امام صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: رسول خدا (صلی اللہ وآلہ) جس وقت (ماہ رمضان المبارک کی) آخری دہائی آتی تھی مسجد میں اعتکاف کرتے تھے، آپ کے لئے بال سے تیار کردہ ایک خیمہ نصب کر دیا جاتا تھا اور ان ایام میں بستر اور لحاف لپیٹ دیا جاتا تھا آپ کے بعض اصحاب کا کہنا ہے کہ حضور اپنی ازواج سے بھی کنارہ گیری اختیار کر لیتے تھے لیکن امام صادقؑ نے فرمایا: یہ بات صحیح نہیں ہے آپ ازواج سے کنارہ گیری نہیں فرماتے تھے۔[6]

---

1. تنبیہ الخواطر ج ۲ ص ۹۱۴ 2. ایضاً ج ۲ ص ۴۹۰ 3. من لا یحضرہ الفقیہ ج ۲ ص ۱۲۳ حدیث ۲۰
4. ایضاً ص ۱۲۰ حدیث ۳ 5. کافی ج ۴ ص ۱۷۵ حدیث ۲ 6. ایضاً ص ۱۷۵ حدیث ۱

تاریخ طبری میں اسرائیلیات

جناب سید جعفر مرتضیٰ عاملی

ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

مکہ مکرمہ میں پیغمبر اسلامؐ کی بعثت، اسلام کے ظہور اور عوام کے درمیان تیزی کے ساتھ اس کے نفوذ اور مقبولیت نے ان لوگوں کے لئے جو ظہور اسلام سے قبل اپنے سلسلہ میں جھوٹے امتیازات کے قائل تھے، بڑی ہی تلخ یادیں چھوڑیں، کیونکہ اسلام کے ظہور اور وسعت نے ان سے ان کے خود ساختہ امتیازات سلب کر لئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان کے وجود میں کینہ و حسد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس آگ نے ان کو اسلام کے خلاف سازش اور حیلہ گری پر آمادہ کر دیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی پوری قوت و طاقت اسلام کی جڑیں کھودنے، اس کی تعلیمات میں تحریف کرنے اور اس کے احکام و مفاہیم کو مسخ کرنے پر صرف کر دی اور اپنی طرف سے خیانت کی کوئی راہ باقی نہیں چھوڑی۔

تبلیغات پر پابندی

وہ مسائل جنھوں نے مخالفین اسلام کی کینہ توزی اور دشمنان اسلام کی دسیسہ کاری کے لئے راہیں ہموار کیں ان میں سے ایک وہ طریقہ تھا جو پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد اسلامی تبلیغات کی روک تھام اور کنٹرول کے لئے اپنایا گیا۔ کیونکہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد حکومت کی سیاست نے تبلیغات پر کنٹرول اور نظارت کی شدت کے ساتھ ضرورت محسوس کی تاکہ موجودہ سیاست اور سیاستمداروں کی صلاح کی خلاف حدیثیں نشر کرنے کی ہمت و جرأت ہی پیدا نہ ہو، یا یہ کہ جب کبھی صاحبان سیاست کسی فقہی یا غیر فقہی مسئلہ میں

اپنے نقطہ نظر کا اظہار کریں تو انہیں اعتراض کا سامنا نہ کرنا پڑے، اور کوئی ان سے نہ کہے کہ یہ نظریہ رسول خداؐ کے فلاں قول و عمل یا فلاں دستور کے خلاف ہے۔[1]

اسی بنا پر احادیث کی کتابت پر پابندی لگا دی گئی اور جتنی حدیثیں اصحاب رسول خدا صلعم نے خود حضورؐ کے زمانۂ حیات میں لکھیں تھیں جلا دی گئیں، کسی بھی روایت کو نقل کرنے کی اسی وقت اجازت تھی جب اس کے دو گواہ موجود ہوں اور جو بھی اس کے خلاف عمل کرتا اسے سزا دی جاتی تھی۔

جی ہاں مسلمانوں پر حاکم سیاست نے اس مسئلہ پر بڑی شدت کے ساتھ عمل کیا اور مختلف شہروں میں مقیم حکومت سے وابستہ اپنے تمام افراد کو حکم دے دیا کہ خبردار رسول خداؐ کی کوئی حدیث ظاہر و افشاء نہ ہونے پائے[2] اور اس کے بعد بڑے بڑے صحابہ اور علماء مدینہ میں قید کر لئے گئے[3]

صرف حکام فتویٰ صادر کرنے کا حق رکھتے تھے ان کے علاوہ کسی کو بھی فتویٰ دینے کی اجازت نہ تھی۔[4] البتہ یہ حق انھیں بھی حاصل تھا جو حکام اور فرمانرواؤں کے ہم رکاب تھے اور ان کی حکومت وسیاست کی تعریف کرتے تھے اور ان کے احکام کو بروئے کار لاتے تھے[5]

---

[1] اسی طرح کے خاص مصادر ہم نے اپنی کتاب الحیاۃ السیاسیۃ للامام الحسنؑ ص ۴۸-۹۰ پر درج کئے ہیں محققین اس موضوع کے ذیل میں کتاب "الصحیح من سیرۃ النبیؐ" جلد اول ص ۲۶ کا بھی مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

[2] ملاحظہ فرمائیں تاریخ الامم والملوک ۳۵ ہجری کے واقعات، مروج الذھب جلد ۲ ص ۳۲۱-۳۲۲ مستدرک الحاکم جلد ۳ ص ۱۲۰ اور جلد ۱ ص ۱۱۰، کنز العمال جلد ۱۰ ص ۱۸۰، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷، شرح نہج البلاغہ المعتزلی الحنفی جلد ۲ ص ۲۰، شرف اصحاب الحدیث ص ۸۷، مجمع الزوائد جلد ۱ ص ۱۴۹، الطبقات الکبریٰ ابن سعد، طالیدن، جلد ۴، ص ۱۳۵ و جلد ۲، قسم ۲ ص ۱۰۰ و ص ۱۱۲، حیاۃ الصحابہ جلد ۳ ص ۲۷۲، ۲۷۳ وغیرہ

[3] ملاحظہ فرمائیں جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۴۵ و ۲۰۳، ۱۹۴ و ۱۷۴، منتخب کنز العمال بحاشیہ مسند احمد جلد ۴ ص ۶۲، سنن الدارمی جلد ۱ ص ۶۱، التراتیب الاداریہ ج ۲ ص ۳۶۷، ۳۶۸، طبقات ابن سعد طبع لیدن جلد ۶ ص ۱۷۹، کنز العمال جلد ۱۰ ص ۱۹۵ (ابن عساکر دینوری فی المجالس وغیرہ سے) تہذیب تاریخ دمشق جلد ۱ ص ۵۴، المصنف صنعانی جلد ۸ ص ۳۰۱ اور اس کے حاشیہ میں اخبار القضاۃ، وکیع سے جلد ۱ ص ۸۳

[4] ملاحظہ فرمائیں: الصحیح فی سیرۃ النبیؐ جلد ۱ ص ۲۶

ایک دوسرا غلط کام سیاست مداروں نے یہ کیا کہ اس زمانے میں قرآن کی تفسیر اور آیات الٰہی کے معانی و مفاہیم کے استفسار کو ممنوع قرار دے دیا۔[1]

چنانچہ ابھی کچھ دن بھی نہ گزرے تھے کہ اسلام سوائے نام کے اور دین سوائے ظاہری شکل کے کچھ اور نہ رہ گیا۔ جیسا کہ اس سے ملتا جلتا بیان امیر المومنین علیہ السلام سے روایت کیا گیا ہے۔[2]

ابھی کچھ عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ صحابہ، جو کچھ رسول خدا صلعم کے عہد مبارک میں تھا، سوائے قبلہ، اذان اور نماز کے سب کچھ فراموش کر چکے تھے، جیسا کہ بعض نصوص میں ذکر ہوا ہے۔[3]

اہل کتاب کے علم کے مقابل عرب کی فریفتگی

تبلیغات پر پابندی کے ساتھ ہی ایک دوسرا مسئلہ جس نے دشمنوں کو اسلام کا چہرہ مسخ کرنے کا موقع فراہم کیا، صدر اول میں اہل کتاب کے علم سے عرب کا مرعوب ہو کر اس پر شیفتہ و فریفتہ ہو جانا تھا۔ کیونکہ عرب جاہلیت کے زمانہ میں علم و معرفت سے بے بہرہ و ناآشنا تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ یہودی احبار اور عیسائی راہبوں کو معرفت اور علم و دانش کا منبع و سرچشمہ خیال کرتے تھے، اور ایک شاگرد جس نظر سے استاد کو دیکھتا ہے یوں ہی عرب اہل کتاب علماء کی طرف دیکھتے تھے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے ظہور اسلام کے بعد بھی جب کہ رسول خدا صلعم ان کو کتاب و حکمت اور آیات الٰہی کی بار بار تعلیم دیتے رہتے تھے، اہل کتاب سے تحصیل کا سلسلہ ترک نہیں کیا تھا اور ان کے مدرسہ میں حاضری دیا کرتے تھے۔[4]

۱۔ الغدیر جلد ۶ صفحہ ۲۹۰، ۲۹۳، حیاۃ الصحابہ جلد ۳ صفحہ ۲۵۸، ۲۵۹

۲۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰ و حکمت ۳۶۹

۳۔ جامع بیان العلم جلد ۲ صفحہ ۲۴۴، ۲۴۵، الموطأ مطبوعہ با تنویر الحوالک جلد ۱ صفحہ ۹۳، شرح الموطأ - الزرقانی جلد ۱ صفحہ ۲۲۱، تنویر الحوالک جلد ۱ صفحہ ۹۳ و صفحہ ۹۴ از الباجی، الام الشافعی جلد ۱ صفحہ ۲۰۸، الغدیر جلد ۸ صفحہ ۱۶۶، الزہد والرقائق صفحہ ۶۱، کشف القناع عن حجیۃ الاجماع صفحہ ۶۷

۴۔ جامع بیان العلم جلد ۲ صفحہ ۱۲۳، صفحہ ۱۲۴ اور ملاحظہ فرمائیں، درمنثور جلد ۱ صفحہ ۹۰ (ابن جریر نے قتادہ اور اسدی سے اور سفیان ابن عیینہ سے بھی یہ بات نقل کی ہے۔ البتہ ان کے مدارک کے نام دوسرے مصادر میں بھی ذکر ہوئے ہیں۔)

یہ بھی ہوتا کہ ان میں سے بعض توریت کا ترجمہ کرتے اور رسول اسلامؐ کے سامنے اس کی تلاوت کرتے، اور ان کے اس عمل سے پیغمبر اسلامؐ کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا اور آپ ان سے فرماتے تھے: کیا تم کو بالکل احمق بنا دیا گیا ہے، جبکہ میں تمہارے لئے "نقیتہ بیضاء" (ایک پاکیزہ و درخشندہ کتاب) لایا ہوں، خدا کی قسم اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو میری اطاعت کے سوا ان کے سامنے کوئی اور راہ نہ تھی"۔[1]

نومسلم اہل کتاب کی علمی انجمن

بہر حال یہودی اور عیسائی علماء کے ایک گروہ نے مسلمان حکمرانوں کے دربار میں خاصی اہمیت حاصل کر لی تھی اور ان کے تئیں خصوصی اہتمام برتا جاتا تھا، چنانچہ معاویہ کے زمانے میں انھوں نے اور ان کے شاگردوں نے شام میں ایک علمی جماعت تشکیل دے رکھی تھی کہ منجملہ ان کے کعب الاحبار، ابو الدرداء، عبداللہ ابن عمرو ابن العاص اور ابو ہریرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

اس جماعت کے افراد کا کام ہی مذکورہ بالا اشخاص کے افکار و نظریات اور اسرائیلیات کی ترویج و اشاعت تھا، اور یہ لوگ یہ کام کھلی ہوئی آزادی اور اطمینان کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔

خاص طور پر جب رسولؐ خدا کی حدیث نقل کرنا ممنوع تھا لیکن بنی اسرائیل سے اس طرح کی تعبیریں نقل کرنا بالکل عام سی بات تھی کہ: **حدثوا عن بنی اسرائیل ولاحرج ..**![2] بنی اسرائیل سے روایت میں کوئی حرج نہیں ہے . . . !

---

[1] یہ حدیث مختلف مصادر میں مختلف عبارتوں کے ساتھ نقل ہوئی ہے نمونہ کے طور پر ملاحظہ فرمائیں: مسند احمد جلد ۳ ص ۳۸۷، ۴۷۰، ۴۷۱ / بحار جلد ۲، ص ۳۴۷ / غریب الحدیث جلد ۴ ص ۴۸ و ۴۹ / میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۶۶۶

[2] المصنف صنعانی۔ جلد ۱ ص ۲۶۱ / صحیح بخاری۔ کتاب الانبیاء باب ۵۰ / مسلم الزھد ص ۷۲ / الترمذی، العلم ص ۱۳ / ابن ماجہ (مقدمہ) ص ۵ / مسند احمد جلد ۳ / وہ روایات جو اسرائیلیات کے نام سے موسوم ہیں اور جو قصہ گویوں اور داستان سراؤں کی تقویت کی طرف اشارہ کرتی ہیں ان کے لئے ملاحظہ فرمائیں: التراتیب الاداریہ جلد ۲ ص ۲۲۴، ۲۲۷، ۲۳۸، ۳۳۸، ۳۴۵، ۳۲۵ - ۳۲۷ / اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۱۲۴ - ۱۲۶، ۱۴۵ - ۱۹۲ / شرف اصحاب الحدیث ص ۱۴ - ۱۷ / فجر الاسلام ص ۱۵۸ - ۱۶۲ / بحوث ←

کچھ ہی عرصہ میں، یہودی اور عیسائی علماء، خلفا اور حکمرانوں کے مشیر و معاون بن گئے اور اس طرح وہ اپنے عقائد و آراء، سیاست، عقائد، تاریخ نیز دیگر دینی میدانوں میں نافذ کرنے اور پھیلانے میں کامیاب ہو گئے۔

چنانچہ کینہ صفت اہل کتاب، جنھوں نے بظاہر اسلام قبول کر لیا تھا، اور ہوس پرست پیشہ ور داستان گو افراد — حتیٰ صحابہ کے زمانہ میں ہی — دینی علوم کو نابود کرنے، اسلامی حقائق میں تحریف کرنے اور اس کی تعلیمات و مفاہیم کو خراب اور بد نما ظاہر کرنے پر کمربستہ ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت دینی حقائق و معارف کے نام پر ان مہملات اور باطل نظریات کے سوا کچھ بھی نہ جانتی تھی جن کے تانے بانے بن کر ان لوگوں نے مسلمانوں کے کان بھر دیئے تھے اور عوام کے افکار و خیالات پر قبضہ جما لیا تھا۔

صدیوں بعد حدیث کی تدوین

ایک عرصۂ دراز کے بعد کہ جس میں لوگوں کو محض کچھ مخصوص قسم کی احادیث نقل کرنے کی ہی اجازت حاصل تھی، اس — دور کا خاتمہ ہوا لیکن یہ وہ وقت تھا جب تحریف پسند عناصر اپنی آرزوؤں کی تکمیل میں کامیابی حاصل کر چکے تھے[1]

سیاست مداروں نے جب اپنے آپ کو آرام و آسائش میں محسوس کیا اور انھوں نے دیکھا کہ ان کے مورد نظر افکار معاشرہ میں اپنی پوری جگہ بنا چکے ہیں اور وہ مفاہیم اور طرز فکر جو ان افکار کی

← فی تاریخ السنۃ المشرفۃ ص ۳۴ — ۳۷/ الزھد والرقائق ص ۱۷۱، ۵۰۸/ تقیید العلم ص ۳۴/ جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۵۰ و ۳/ مجمع الزوائد جلد ۱ ص ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۸۹/ المصنف صنعانی جلد ۶ ص ۱۰۹، ۱۱۰ اور اس کے حاشیے/ مشکل الآثار جلد ۱ ص ۴۰۲، ۴۱۰/ البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۶ و جلد ۲ ص ۱۳۲ و ۱۳۴/ کشف الاستار جلد ۱ ص ۱۲۰، ۱۲۲، ۱۰۸ و ۱۰۹/ حیاۃ الصحابہ جلد ۳ ص ۲۹۶/ مسند احمد جلد ۳ ص ۱۲، ۱۳ و ۵۶/ حق التنبیہ

[1] طبقات ابن سعد طبع صادر جلد ۲ ص ۳۳۶

حفاظت کے لئے ضروری ہیں مسلمانوں کے قلب و دماغ میں بیٹھ چکے ہیں تو انھوں نے تدوین حدیث پر عائد پابندی اٹھائے جانے کے لئے موقع مناسب جانا، یہی وجہ تھی اموی خلیفہ عمر ابن عبد العزیز کے زمانے میں تدوین حدیث آزاد کردی گئی[1] اور محدثین و مورخین حدیثیں نقل و محفوظ کرنے میں مشغول ہوگئے، اور پھر جو کچھ بھی ہاتھ آیا حق و باطل، اہم و غیر اہم کی تمیز کئے بغیر حدیث و تاریخ کے عنوان سے محفوظ کر لیا گیا۔

حفاظت اسلام میں اہل بیتؑ کا کردار

ایسے ماحول اور حالات میں یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ عین اسی زمانہ میں جب اسلام کے خلاف ان تمام سازشوں، تحریفوں اور فتنہ سامانیوں کا بازار گرم تھا اسلام کی ایک حقیقی و واقعی ضمانت بھی موجود تھی جس نے دین و احکام اور اس کے بنیادی و اصولی امتیازات و خصوصیات کی حفاظت و نگہبانی کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی یہ ضمانت ائمہ اطہار علیہم السلام کی ذوات مقدسہ میں مجسم ہوئی تھی، انھیں جہاں کہیں بھی موقع ہاتھ آتا اور حالات اجازت دیتے، وہ حق کو آشکار کرتے ہوئے اسلام میں وارد ہوجانے والے (کعب الاحبار، ابن سلام اور ان کے شاگردوں جیسے) مسلمان نما اہل کتاب کے پست ذلیل اور مردود افکار و نظریات کا پردہ چاک کرتے رہتے تھے[2]۔

ائمہ اطہار علیہم السلام ایسا کیوں نہ کرتے جبکہ ان کی مثال کشتی نوحؑ کی تھی، کہ جو ان کی کشتی پر سوار ہوا اس کو نجات حاصل ہوئی اور جس نے ان سے روگردانی اختیار کی (طوفان ضلالت میں) غرق ہوگیا۔ اور پیغمبر اسلامؐ کے اعلان کے مطابق قرآن کریم اور اہل بیت ہی وہ دو ثقل ہیں کہ جس نے ان دونوں سے تمسک اختیار کیا ہرگز گمراہ نہیں ہوسکتا۔

اسرائیلی تفکر سے شیعوں کی جنگ

شیعوں نے بھی ان معصوم پیشواؤں کی پیروی کرتے ہوئے گمراہ کن اسرائیلی طرز تفکر،

---

[1] السنۃ قبل التدوین ص ۳۶۲ / جامع بیان العلم و فضلہ جلد ۱ ص ۷۶

[2] بحار الانوار جلد ۴۶ ص ۳۵۴

اور ان کے مظاہر و آثار سے جنگ میں کھلا کردار ادا کیا ہے، اور بدنہاد حکومت و حاکمیت کی پشت پناہی کے باوجود جس سے یہ کینہ صفت فائدہ اٹھا رہے تھے، شیعوں نے ہمیشہ اپنے کاندھوں پر ان کی مخالفت کا علم بلند رکھا۔

اس میدان میں کعب الاحبار کے خلاف جناب ابوذر کی استقامت کا ہم ذکر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے خلیفۂ ثالث (عثمان) کے دربار میں کعب کو عصا مارتے ہوئے کہا تھا: "یابن الیھودیہ! تعلمنا دیننا!" او یہودی کی اولاد! ہم کو ہمارا دین تعلیم دیتا ہے!! البتہ اس جلیل القدر صحابی کو عثمان سے اس کا بدلہ جلاوطنی اور اپنے دیار سے دربدری کے سوا کچھ نہ ملا! یہاں تک کہ آپ کو بے پناہ مشکلات اور بلاؤں کا سامنا کرنا پڑا اور جلاوطنی کے عالم میں اپنے وطن سے دور سرزمین "ربذہ" پر تنہائی کے عالم میں مظلومیت کے ساتھ جان دینی پڑی۔[۲]

علوم حدیث ـ انحرافات کی بقا کے لئے نہ کہ ان سے بچنے کے لئے

اسلام کے سچے پیروؤں کی کوششیں اور جہاد اگرچہ اسلام کی حفاظت و نگہبانی میں مؤثر ثابت ہوئے لیکن یہ کوششیں زیادہ تر اسی گروہ تک محدود رہیں جس کی رہبری ائمہ معصومین علیہم السلام کے ہاتھ میں تھی اور ان شیعہ اور اس مکتب میں تربیت پانے والے افراد کے کاندھوں پر تھی۔ دوسرے لوگ حکام کی سیاست کی پیروی کرتے رہے اور اہل کتاب کے بہت سے دسیسہ آمیز اور تحریف شدہ مطالب ان سے حاصل کرکے اپنی کتابوں اور حدیثی و غیر حدیثی مجموعوں میں، ان سے متعلق کوئی تحقیق و جستجو اور راہ حل تلاش کئے بغیر، من وعن منتقل کرتے رہے۔ اور اگر غور و فکر سے کام لیا بھی تو بہت ہی محدود میدانوں میں، جو سطحی امور سے مربوط ہیں، اس کے علاوہ ان کی تحقیقات ایسے اصولوں اور معیاروں پر انجام پاتی تھیں کہ ان سے انحرافات کو بڑھاوا ملنے اور اس کی جڑوں کو مزید تقویت پہنچنے کے علاوہ کچھ بھی

۱۔ تاریخ الامم والملوک جلد ۴ ص ۲۸۴ / مروج الذہب جلد ۲ ص ۳۴۰ / انساب الاشراف جلد ۵ ص ۵۲ / شرح نہج البلاغہ المعتزلی جلد ۳ ص ۵۴ / و جلد ۸ ص ۲۵۶

۲۔ دراسات و بحوث فی التاریخ والاسلام جلد ۱ ص ۱۱۱ - ۱۴۱

حاصل نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ اصول وضوابط ان مہملات و اباطیل کی حفاظت کی غرض سے ان ہی کے متون سے اخذ کئے گئے تھے۔

جو معیارات اور اصول وضوابط واقعی طور سے ان اباطیل کی بیخ کنی کر سکتے تھے، ان سے قطعی طور پر احتراز اور پرہیز برتا گیا یہاں تک کہ وہ احادیث جو روایات کو کتاب خدا کی روشنی میں پرکھنا اور تولنا لازم قرار دیتی تھیں دیوار پر مار دی جاتی تھیں اور ان کو زنادقہ کے ہاتھوں وضع کی جانے والی جعلی حدیثیں قرار دے دیا جاتا تھا[1] کہا جاتا تھا کہ "حدیث کتاب (خدا) کے بارہ میں فیصلہ کرتی ہے نہ کہ کتاب حدیث کے بارہ میں"[2] نیز کہا جاتا تھا "کلّ من روی لہ البخاری فقد جاز القنطرۃ" (جو کچھ بخاری نے روایت کیا ہے اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے) اور "کلّ فی الصحیحین فھو صحیح" (جو کچھ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے صحیح ہے) وغیرہ۔

ایک طرف تو اس قسم کے کھوکھلے اصول وضوابط تھے اور دوسری جانب عقائد کی غلط بنیادیں تھیں جو ان اصول وضوابط کو جہت عطا کرنے میں مؤید و مددگار ثابت ہوتی تھیں مثال کے طور پر "حسن و قبح عقلی سے انکار، حکام کے سامنے تسلیم وکورنش کا لازمی جاننا، نبوت کے بعد اجماع کی نبوت کا قائل ہونا،[3] جبر کا عقیدہ، قرآن کے قدیم ہونے کا عقیدہ وغیرہ وغیرہ۔

1۔ جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۲۳۳ / ارشاد الفحول ص ۳۳ / بحوث مع اهل السنۃ السلفیہ ص ۶۷، ۶۸۔

2۔ تاویل مختلف الحدیث ص ۱۹۹ / سنن الدارمی جلد ۱ ص ۱۴۵ / مقالات الاسلامیین جلد ۲ ص ۲۲۴ ج ۱ ص ۲۵۱، جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۲۳۳ و ۲۳۴ / عون المعبود جلد ۱۲ ص ۳۵۶ اور ملاحظہ فرمائیں الکفایۃ فی علم الروایہ۔ الخطیب۔ ص ۱۴ / لسان المیزان جلد ۱ ص ۱۹۴ / میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۱۰۷ / دلائل النبوۃ۔ بیہقی۔ جلد ۱ ص ۲۶ / الجامع لاحکام القرآن جلد ۱ ص ۳۸ و ۳۹

3۔ "المنتظم" ۔ ابن الجوزی۔ جلد ۹ ص ۲۱۰ الالمام ج ۶ ص ۱۲۶ / الاحکام فی اصول الاحکام۔ الامدی ج ۱ ص ۲۴۳ و ۲۰۵ / بحوث مع اہل السنہ والسلفیہ ص ۲۷ المنتظم اور ابی الوفاء سے، ابن عقیل بزرگ اہل حنابلہ سے ہیں اس سلسلہ میں کہ جب کبھی اجماع قائم ہو جائے۔ جہاں اور جس زمانہ میں بھی ہو حجت ہے مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں: الاحکام فی اصول الاحکام جلد ۱ ص ۲۰۸ / تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۴۲ / النشر فی القراءات ←

تاریخ طبری اور اسرائیلیات

محمد بن جریر طبری کی تحریر کردہ کتاب "تاریخ الامم والملوک" اس طرح کی کتابوں کا ایک بہترین نمونہ ہے کہ جو اسرائیلیات اور ان مہملات و اباطیل سے بھری پڑی ہے جو اہل کتاب ہواپرستوں اور داستان گویوں نے اختراع کئے تھے۔

تاریخ طبری کی محض پہلی جلد کا دقیق نظروں سے مطالعہ اس تلخ واقعیت کو اجاگر کرتے اور ہمارے دعوے کو قطعی شکل میں ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اگر ہم تفصیل کے ساتھ وارد بحث ہونا چاہتے اور صرف تاریخ طبری سے تمام مثالیں پیش کرتے تو اگر ہزاروں نہیں تو کم از کم سیکڑوں صفحات میں خود کو گھرا ہوا پاتے لہٰذا ہم نے محض چند مثالیں بیان کرنے پر اکتفا کی ہے کہ جو بات ہم نے کہی ہے اس کے واضح نمونے آپ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ فرمائیں۔

ذبیح کون؟ حضرت اسمٰعیلؑ یا حضرت اسحاقؑ

طبری کہتا ہے:

"ہر دو قول پیغمبر اسلام سے روایت ہوئے ہیں اور اگر ان دونوں قولوں میں سے ایک صحیح ہوتا تو ہم اس سے آگے نہ بڑھتے اور دوسرا قول نقل نہ کرتے، جی ہاں یہ نکتہ کی بات ہے کہ اسحاق کے ذبیح ہونے کی روایت کے صحیح ہونے پر قرآنی دلیل دوسری روایت کے مقابل زیادہ روشن طور پر دلالت کرتی ہے[۱]"

اس کے بعد طبری نے وہ روایتیں نقل کی ہیں جن میں جناب اسمٰعیلؑ کو ذبیح بتایا گیا ہے یہ روایتیں ابن عمر، الشعبی، یونس ابن مہران، مجاہد، الحسن، محمد ابن کعب القرظی، ابن عباس

← المستصفی جلد ۱ ص ۳۳۰، ۳۱۰ / نیز اصول فقہ کی دوسری کتابیں جن میں اہل سنت کے نقطۂ نظر سے اجماع کی حجیت پر بحث کی گئی ہے۔

[۱] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۲۶۳

اور معاویہ سے نقل کی گئی ہیں۔ اور جن لوگوں نے ابن عباس سے جناب اسمٰعیل کا ذبیح ہونا نقل کیا ہے ان کے نام یہ ہیں ـــــ سعید ابن جبیر، الشعبی، یونس ابن مہران، ابوالطفیل مجاہد اور عطاء ابن ابی رباح[1]

اسی کے بعد طبری نے وہ روایتیں نقل کی ہیں جن میں جناب اسحٰق کا ذبیح ہونا ذکر ہے، اور ان روایتوں کے ناقل عباس ابن عبدالمطلب ابن مسعود، عبید ابن عمیر، ابن سابط، ابن ابی الھذیل، ابی میسرہ، مسروق، ابن عباس اور کعب الاحبار، ابن عباس سے یہ روایت نقل کرنے والے عکرمہ، ابو مالک اور ابو صالح ہیں[2]

اس کے بعد طبری کہتا ہے: "لیکن جو چیز قرآن میں اسحٰق سے متعلق روایت کے زیادہ صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہے وہ آیت ہے جس میں قوم والوں سے جدا ہو کر اپنی بیوی "سارہ" کے ساتھ شام کی طرف ہجرت اختیار کرتے وقت خلیل خدا حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا ذکر ہے کہ:-

انی ذاھب الی ربی سیھدین رب ھب لی من الصالحین

(صافات / ۹۹، ۱۰۰)

"جناب ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں جو یقیناً میری ہدایت کرے گا، بارالٰہا مجھے ایک فرزند جو صالحین میں سے ہو عطا فرما۔"

"یہ دعا اس وقت سے مربوط ہے جبکہ ابھی ابراہیمؑ ھاجرہ کو نہیں جانتے اور ھاجرہ ابھی اسمٰعیلؑ کی ماں بھی نہیں بنی ہیں لیکن خداوند عالم ابراہیمؑ کی دعا کے بعد دعا قبول ہونے کی خبر دیتے ہوئے انھیں ایک حلیم و بردبار بیٹے کی بشارت دیتا ہے اور اسی کے بعد جناب ابراہیمؑ کے خواب کا ذکر کرتا ہے کہ وہ خواب میں اس بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں"

طبری کہتا ہے: "نہیں سنا گیا ہے کہ کسی کتاب میں ہو کہ (قرآن مجید میں) ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ کے علاوہ کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی ہو قرآن کہتا ہے:-

وامرأته قائمة فضحکت فبشرناها باسحٰق ومن وراء اسحٰق یعقوب (ھود / ۷۱)

---

[1] تاریخ الامم والملوک جلد ا ص ۲۶۹، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۷، ۲۶۷ و ۲۷۱

[2] تاریخ الامم والملوک ج ا ص ۲۶۳ و ۲۶۷

"ابراہیمؑ کی بیوی (سارہ) کھڑی تھی کہ اس کو ہنسی آگئی پس ہم نے اس عورت کو فرزند اسحٰق کی اور پھر اسحٰق کے بعد (ان کے فرزند) یعقوب کی بشارت دی۔"

نیز خدا فرماتا ہے:۔

فاوجس منهم خيفة قالوا لاتخف وبشروه بغلام عليم فاقبلت امرأته في صرة فصكت وجهها وقالت عجوز عقيم (ذاریات/۲۹)

"اس وقت ان سے سخت بیم وفکر میں مبتلا ہو گئے (ان فرشتوں نے جب ابراہیمؑ کو ہراساں پایا) تو کہا ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے اور ان کو ایک عالم و دانا پسر کی بشارت دی، اس وقت زوجۂ ابراہیمؑ (سارا) نے خوشی کا نعرہ لگاتے ہوئے ان کی طرف رخ کیا اور (بیتابی شوق میں) چہرے پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا میں ایک بوڑھی عورت ہوں اور بچہ پیدا کرنے کے لائق نہیں ہوں۔"

ان موارد کے علاوہ بھی جہاں کہیں خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو فرزند کی خوش خبری دی ہے ان کی زوجہ جناب سارہ کے سلسلہ میں ہی ہے۔"

اس اعتبار سے (سورۂ صافات) کی آیت (۱۰۱) میں "فبشرناه بغلام حلیم" (ہم نے ان کو ایک حلیم و بردبار فرزند کی خوشخبری دی) سے بھی دیگر تمام سوروں کی آیتوں کی طرح سارہ سے متولد ہونے والے فرزند کی بشارت کو ہی مراد لینا چاہیے۔"

لیکن جن لوگوں نے اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ (خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ کے ذبح کرنے پر مامور نہیں کیا تھا کیونکہ خداوند عالم کی طرف سے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی ولادت سے قبل بشارت دی گئی تھی) ان کا اعتراض وارد نہیں ہے کیونکہ خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو حکم دیا تھا کہ اسحاقؑ کو سعی و کوشش کے مراحل طے کر لینے کے بعد ذبح کریں، اور کوئی مانع نہیں ہے کہ ابراہیم کو جس وقت فرزند اسحاقؑ کے ذبح کا حکم دیا گیا ہو اس سے قبل ان کے یہاں یعقوبؑ پیدا نہ ہو چکے ہوں۔"[1]

ہماری بات

پس طبری نے اپنے اس بیان کے ذریعہ اسحاقؑ کا ذبیح ہونا قبول کیا ہے جیسا کہ آپ نے اس سلسلہ میں طبری کا استدلال ملاحظہ فرمایا، حالانکہ اس نظریہ اور استدلال کا غلط ہونا واضح ہے؛ کیونکہ:۔

---

[1] تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۲۷۰ و ۲۷۱

اوّل: یہ کہ رسولؐ خدا سے جو روایت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا: "انا ابن الذبیحین (میں دو ذبیحوں — اسمٰعیل اور عبداللہ — کا فرزند ہوں) اور یہ واضح ہے کہ نبی اکرمؐ اسمٰعیلؑ کی نسل سے ہیں نہ کہ اسحٰق کی نسل سے۔[1]

دوّم: یہ کہ خداوند متعال سورۃ الصافات میں ذبح کا قصہ ذکر کرنے کے بعد اسحاقؑ سے متعلق بشارت دینے کا ذکر کرتا ہے:-

وبشرناه باسحاق نبیاً من الصالحین (آیت/۱۱۲)

اور ہم نے اس (ابراہیمؑ) کو ان کے فرزند اسحٰق کی بشارت دی کہ جو صالحین میں سے ایک نبی ہے

اور یہ بشارت ولادت (اسحاقؑ) کی بشارت ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ولادت کی بشارت ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے:-

"فبشرناها باسحاق ومن وراء اسحاق یعقوب" (ہود/۷۱)

اور ہم نے اس عورت (سارہ) کو اسحاق اور پھر ان سے یعقوب کی (ولادت کی) بشارت دی

پس ابراہیمؑ کو جس وقت اسحاق کی ولادت کی بشارت دی گئی ان کو یہ بشارت بھی ملی کہ اسحاق بڑے ہوں گے اور ان سے یعقوب پیدا ہوں گے پس کیسے ممکن ہے کہ خداوند عالم نے خود اسحاق کے ذبح کا حکم بھی دیا ہو!

روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی اسی بات سے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے استدلال فرمایا ہے۔ اور محمد بن کعب القرظی نے بھی یہی طریقہ استدلال اپنایا ہے۔[2]

اور جناب ابراہیم کا انداز کلام بھی اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے آپ فرماتے ہیں:-

الحمد لله الذی وهب لی علی الکبر اسماعیل واسحاق (ابراہیم/۳۹)

اس خدا کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے مجھے بڑھاپا آنے کے بعد اسمٰعیل و اسحاق (جیسے

---

[1] تاریخ الامم والملوک ص ۲۶۴

[2] تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۲۶۹ و ۲۷۰ / نیز ملاحظہ فرمائیں المیزان ج ۱۷ ص ۱۵۵ / البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۶۱ و ۱۵۹

دو فرزند) عطا کئے۔

اپنے اس کلام میں جناب ابراھیمؑ نے اسمٰعیل کو اسحاق پر مقدم کیا ہے جیسا کہ چھ دوسری آیتوں میں بھی اسمٰعیل کا اسحاق سے پہلے ذکر ہوا ہے۔

سوم: کلام اللہ میں جہاں ارشاد ہوتا ہے: "وبشّرناہ باسحاق نبیاً من الصالحین" چونکہ خداوند عالم نے ایک ایسے فرزند کی خوشخبری سنائی ہے جو بزرگ ہو کر ایک صالح نبی ہونے والا ہے، اس کی شادی ہوگی، صاحب اولاد ہوگا (کیونکہ اسحاق کے ساتھ ہی یعقوب کی بھی بشارت دی گئی ہے۔ ھود/۱۷) لھٰذا یہ بات معقول نہیں ہے کہ خداوند عالم ان امور کی انجام دہی سے قبل اس کے ذبح کا حکم دے اس لئے کہ اگر اس طرح کا حکم ان بشارتوں کے بعد دیا جائے تو بے شک ایک واقعی و حقیقی حکم نہیں کہا جائے گا بلکہ صرف دکھلاوے کا ایک غیر سنجیدہ حکم ہو کر رہ جائے گا اور ذبح و امتحان کی اہمیت بھی مفقود ہو جائے گی۔

پس خداوند عالم کے اس فرمان: "وبشّرناہ باسحاق نبیاً..." اور "وامرأتہ قائمۃ فضحکت، فبشّرناھا باسحاق ومن وراء اسحاق یعقوب" پر بھی توجہ رکھنا ضروری ہے۔

چھارم: ابن کثیر نے کہا ہے کہ قوموں کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اسمٰعیل ابراھیمؑ کے سب سے بڑے اور سب سے پہلے فرزند ہیں[۵۱]۔ اور طبری نے بھی اس بات کی وضاحت کی ہے جیساکہ آپ جلد ہی ملاحظہ فرمائیں گے۔

پنجم: طبری نے جس چیز کو سند بنایا ہے صحیح نہیں ہے کیونکہ جناب سارہ کو پیری کے عالم میں اسحاق کی بشارت دیا جانا اس بات کو ثابت نہیں کرتا کہ جناب ہاجرہ اس بشارت سے قبل ایک ۱۴ سالہ فرزند اسمٰعیلؑ کی ماں نہیں تھیں کیونکہ جناب سارہ کا پیری کی وجہ سے بانجھ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ جناب ہاجرہ بھی ولادت کے قابل نہ تھیں خاص طور پر جب تقریباً ۱۵ سال سے دونوں کے درمیان دوری رہی ہے اور طبری نے خود اپنی کتاب میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے کہ جناب سارہ کے

---

۵۱ البدایۃ والنھایۃ، ج ۱ ص ۱۵۷

یہاں فرزند (اسحاق) کی ولادت سے قبل، جناب ہاجرہ کے یہاں اسمٰعیل پیدا ہو چکے تھے، اسی وجہ سے اپنے یہاں اولاد نہ ہونے کے سلسلہ میں جناب سارہ سخت ملول تھیں۔[1]

اسی طرح "بلوغ السعی" سے مراد یہ ہے کہ رفت و آمد پر اختیار و قدرت حاصل ہو جائے نہ یہ کہ مرد ہونے والا ہو گیا ہو پس طبری کی بات اس کے اس قول کو درست نہیں ٹھہرا سکتی کہ "ممکن ہے اسحاقؑ کے ذبح کا حکم ان کی شادی اور جناب یعقوبؑ کی ولادت کے بعد دیا گیا"[2] ورنہ زمانۂ آئندہ میں "بلوغ السعی" سے تعبیر کی کوئی ضرورت نہ تھی بلکہ خداوند عالم کا اتنا فرما دینا کافی تھا کہ: ابراہیم کو جب وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کے فرزند کے ذبح کا حکم دیا گیا جو کامل مرد ہو چکا تھا۔

کعب الاحبار اور ذبح کا مسئلہ

اب ہم کعب الاحبار پر ایک نظر ڈالتے ہیں جس نے باوجود اس کے کہ اس کا نظریہ قرآن کے مخالف ہے جناب اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کی روایت بیان کی ہے۔ کعب ہی وہ شخص ہے جس نے جناب اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کی روایت گڑھی ہے اور اپنی بات ان لوگوں کے دلوں میں اتاری ہے جو اس کو قبول کرنے پر آمادہ تھے وہ جانتا تھا کہ ان لوگوں کے ذریعہ اپنے باطل نظریات کو رواج دے سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں طبری نے روایت یوں نقل کی ہے:۔

"حدثنی یونس، قال: اخبرنا ابن وهب، قال: اخبرنی یونس عن ابن شهاب: ان عمرو بن ابی سفیان بن اسید بن جاریه الثقفی اخبره ان کعب قال لابی هریره: الا اخبرك عن اسحاق بن ابراهیم النبی قال ابو هریره: بلی...."

"کعب الاحبار نے ابو ہریرہ سے کہا: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اسحاقؑ کے بارے میں، جو خدا کے نبی ابراہیمؑ کے فرزند تھے خبر دوں؟ ابو ہریرہ نے کہا: ہاں...."

---

[1] "تاریخ الامم والملوک" ج ا ص ۲۴۷، ۲۵۳

[2] "تاریخ الامم والملوک" ج ا ص ۲۷۱

کعب نے کہا: ابراھیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے فرزند اسحاق کو ذبح کر رہے ہیں۔ شیطان نے کہا خدا کی قسم! اگر آل ابراھیم کو اس مسئلہ میں فریب نہ دوں تو اس کے بعد ان میں سے کسی ایک کو فریب نہیں دے سکتا یہی وجہ ہے کہ شیطان نے ایک شناسا شخص کی شکل اختیار کی کہ جس سے آل ابراھیمؑ واقف تھی، اس کے بعد جب ابراھیمؑ اسحاق کو ذبح کرنے کے ارادہ سے نکلے تو شیطان، اس شناسا کی شکل میں ابراھیمؑ کی زوجہ سارہ کے پاس آیا اور ان سے کہا: ابراھیمؑ اس وقت اسحاقؑ کو کہاں لے گئے ہیں؟ سارہ نے کہا: کسی ضروری کام سے اپنے ساتھ لے گئے ہیں، شیطان نے کہا: نہیں خدا کی قسم! وہ اس لئے نہیں لے گئے ہیں، سارہ نے پوچھا: پھر کیوں ان کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں؟

شیطان نے جواب دیا: ان کو ذبح کرنے کے لئے ساتھ لے گئے ہیں۔

سارہ نے کہا: یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے، ابراھیمؑ اپنے بیٹے کو قتل نہیں کریں گے۔

شیطان نے کہا: لیکن خدا کی قسم یہی صحیح ہے جو میں نے کہا ہے۔

سارہ نے پوچھا: اسحاق کو قتل کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

شیطان نے کہا: ابراھیمؑ کو گمان ہے کہ ان کے پروردگار نے انھیں بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔

سارہ نے کہا: اگر ایسا ہے، تو اسی میں بھلائی ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے حکم کی اطاعت کریں۔

طبری اس کے بعد روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے نقل کرتا ہے کہ شیطان اسحاق کے پاس گیا اور اسی قسم کی گفتگو ان سے بھی کی، اور ان سے بھی اس کو وہی جواب ملا، اس کے بعد وہ لکھتا ہے:۔

"پس شیطان نے اسحاق کو بھی چھوڑا اور جناب ابراھمؑ کی طرف بڑھا اور ان سے کہا: یہ صبح صبح اپنے بیٹے کو کہاں لے جا رہے ہو؟

ابراھیمؑ نے کہا: ایک ضروری کام کے لئے۔

شیطان نے کہا: خدا کی قسم! تم اپنے فرزند کو قتل کرنے کے لئے لے جا رہے ہو!

ابراھیمؑ نے کہا: میں کیوں اس کو قتل کروں گا؟

شیطان نے کہا: کیونکہ تمہارا خیال ہے کہ تمہارے خدا نے اس کے قتل کا حکم دیا ہے۔

ابراھیمؑ نے کہا: پس خدا کی قسم اگر میرے پروردگار نے مجھ کو حکم دیا ہوگا، تو میں ایسا ہی کروں گا۔

کعب الاحبار کہتا ہے: پس جس وقت ابراھیمؑ نے اپنے فرزند کے ذبح کا اقدام کیا اور اسحاق نے

ان کی خواہش کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تو خداوند عالم نے ان کو بخش دیا اور ایک "ذبح عظیم" کو ان پر نثار کر دیا ....." [1]

ابوہریرہ نے دو دوسری روایتوں میں بھی کعب الاحبار سے نقل کیا ہے کہ "ذبیح" جناب اسحاق تھے، اور ان دونوں روایتوں کو بھی طبری نے نقل کیا ہے جو اس کی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔[2]

ذبیح کے بارے میں توریت کا نظریہ

توریت میں ہے: خذ ابنك، وحيدك الذي تحبه اسحاق واذهب الى ارض المريا واصعده هناك محرقة على ....[3]

اپنے اکلوتے اور چہیتے بیٹے اسحاق کو .... ہماری بارگاہ میں فدیہ کر دو۔

بنابریں: ایسا لگتا ہے کہ اسحاق کے ذبیح ہونے کے قائل افراد نے یہ نظریہ توریت سے اخذ کیا ہے، ابن کثیر کہتا ہے:۔

انما اخذوه — والله اعلم — من كعب الاحبار، او من صحف اهل الكتاب وليس في ذالك حديث صحيح عن المعصوم، حتى نترك من اجله ظاهر الكتاب"[4]

بے شک ان لوگوں نے یہ نظریہ — واللہ اعلم — کعب الاحبار سے یا پھر اہل کتاب کے صحیفوں سے اخذ کیا ہے، اور اس ضمن میں کوئی صحیح حدیث معصوم سے نہیں ہے کہ ہم ظاہر کتاب کے روشن بیان کو ترک کر دیں۔

اور خود طبری نے ایک روایت ابن عباس سے نقل کی ہے جس میں اس ضمن میں یہودیوں کے اتہام کی بات کہی ہے:۔

عن يونس بن عبد الاعلى قال: حدثنا ابن وهب، قال اخبرني عمر بن قيس عن عطاء بن ابي رباح، عن عبد الله بن عباس، انه قال: المفدى

---

[1] تاریخ الامم والملوک جلد ا ص ۲۶۵، ۲۶۶

[2] تاریخ الامم والملوک جلد ا ص ۲۶۵

[3] عہد قدیم ـ سفر تکوین، اصحاح ۲۲ فقرہ ۱ ـ ۲ نیز ملاحظہ فرمائیں اصحاح آخر تک

[4] البدایہ والنہایہ ج ا ص ۱۶۱، ۱۵۹

اسمٰعیل و زعمت الیهود انه اسحاق، وکذبت الیهود[1]

یونس ابن عبد الاعلیٰ سے روایت ہے وہ کہتا ہے: ہم سے ابن وہب نے بیان کیا، کہا کہ مجھ کو عمر ابن قیس نے عطاء ابن ابی رباح سے روایت کرتے ہوئے خبر دی اور اس سے عبد اللہ ابن عباس نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں: اسمٰعیل نے قربانی پیش کی ہے، یہودی خیال کرتے ہیں کہ وہ اسحاق ہیں —— اور یہ یہودیوں کا جھوٹ اور افتراء ہے۔

اموی خلیفہ کے اطمینان قلب کے لئے

جس وقت اموی خلیفہ عمر ابن عبد العزیز نے کعب قرظی سے سنا کہ اسمٰعیلؑ ذبیح ہیں اور قرآن مجید سے اس کا استدلال سنا، تو اس کا قلب مطمئن نہ ہوا، یہاں تک کہ اس نے اسلام قبول کرنے والے ایک یہودی سے اس سلسلہ میں استفسار کیا!

اس واقعہ کو طبری یوں نقل کرتا ہے:۔

حدثنا ابن حمید، قال: حدثنا سلمة، قال: حدثنا محمد بن اسحاق، عن بریدة بن سفیان بن فروة الاسلمی، عن محمد بن کعب القرظی انه حدثهم: انه ذکر ان الذبیح هو اسمٰعیل، مستدلاً علیٰ ذلك بالآیات القرآنیة (حسبما تقدم ذکره) لعمر بن عبد العزیز وهو خلیفته، اذ کان معه بالشام فقال له عمر ان هٰذا الشیٔ ما کنت انظر فیه وانی لاراه کما قلت ثم ارسل الی رجل کان عنده بالشام، کان یهودیاً فاسلم، فحسن اسلامه وکان یری انه من علماء الیهود، فسأله عمر بن عبد العزیز عن ذالك"

محمد بن کعب قرظی کہتا ہے میں عمر ابن عبد العزیز کے پاس تھا کہ اس نے اسلام لانے والے

---

[1] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۲٦۸

ایک یہودی سے کہا ابراہیمؑ کے دونوں فرزندوں میں سے کس کے لئے ذبح کا حکم وارد ہوا ہے؟

اس شخص نے جواب دیا: اسمٰعیل اے امیرالمومنین! خدا کی قسم یہودیوں کو یہ معلوم ہے لیکن چونکہ انہوں نے عربوں سے حسد و جلن کی اور نہیں چاہا ان کے باپ کو ذبیح کے طور پر جانا جائے، اس واقعیت کا انکار کردیا اور اسحاق کو ذبیح قرار دیا اس لئے کہ وہ ان کے باپ ہیں"۔ [1]

۲۔ خدا کی جسمیت اور صورو ہیکل سے متعلق روایات

اس میں کوئی شک نہیں کہ ذات خدا کی جسمیت کا قائل ہونا، اور اسی طرح مختلف ادوار میں بتوں کی پرستش کرنا یہودیوں اور پھر نصرانیوں کے عقائد میں سے رہا ہے کیونکہ موجودہ تحریف شدہ توریت و انجیل میں مختلف موارد کے تحت متعدد مقامات پر اس قدر تصریح موجود ہے کہ اس سلسلے میں توریت و انجیل سے موارد پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس عقیدہ نے مسلمان ہونے والے اہل کتاب کے ذریعہ اسلامی ثقافت میں راہ بنائی ہے اور ان روایات کی صورت میں، جو خداوند عالم کے لئے ہاتھ، انگشت، قدم، پنڈلی اور چہرے وغیرہ کا وجود ثابت کرتی ہیں، ظاہر ہوا ہے۔ حدیث و تاریخ نیز بعض دیگر کتابوں میں یہ عجیب و غریب روایتیں بالکل گھل مل گئی ہیں یہاں تک کہ امام الائمہ ابن خزیمہ نے (جنھوں نے تیسری صدی ہجری کے آخر میں وفات پائی ہے) چار سو صفحات پر مشتمل ایک مستقل کتاب "التوحید و اثبات صفات الرب" کے عنوان سے لکھی اور اس میں اس طرح کی حدیثیں جمع کی ہیں۔

ہم یہاں طبری کی کتاب "تاریخ الامم والملوک" میں مذکور ایسے تمام موارد کا احصاء کرنا نہیں چاہتے بلکہ محض ایک روایت نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، طبری لکھتا ہے:۔

---

[1] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۲۷۰

حدثنی محمد بن سہل بن عسکر، حدثنا اسماعیل بن عبد الکریم قال حدثنی عبد الصمد: انہ سمع وہباً یقول وذکر من عظمتہ فقال ان السموات والارض والبحار لفی الھیکل۔۔۔"

یعنی تمام آسمان، زمین اور دریا ایک ڈھانچے اور ہیکل میں پائے جاتے ہیں اور ہیکل کرسی میں مستقر ہے اور خداوند عزوجل کے دو پاؤں کرسی پر ہیں اور وہ کرسی کو اٹھائے رہتا ہے اور کرسی اس کے پاؤں میں ایک جوتی کے مانند ہے، وہب سے سوال کیا گیا کہ ہیکل کسے کہتے ہیں؟

اس نے کہا، آسمانوں کے گرد اگرد ایک چیز ہے جو زمینوں اور دریاؤں کو ہر طرف سے خیمہ کی طناب کی مانند احاطہ کئے ہوئے ہے۔

وہب سے سوال ہوا کہ زمینیں کس طرح کی ہیں؟

اس نے کہا: سات زمینیں ہیں، جن میں سے ہر ایک کسی جزیرہ کی مانند وسیع و آمادہ ہے تمام زمینوں کے درمیان ایک دریا ہے اور دریا ان سب کو گھیرے ہوئے ہے اور ہیکل دریا سے الگ چیز ہے[۱]۔

ہیکل سے متعلق اس طرح کی باتیں موجودہ تحریف شدہ توریت اور انجیل میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں، جن کا آپ خود مطالعہ فرما سکتے ہیں[۲]۔

۲۔ جبر سے متعلق حدیثیں

خداوند عالم سے متعلق جبر کا عقیدہ بھی ان ہی عقائد میں سے ہے جس نے مسلمان ہونے والے اہل کتاب کے ذریعہ اسلامی ثقافت میں نفوذ پیدا کیا ہے، ان لوگوں کا عقیدہ ہے:۔

لقد جف القلم بما ھو کائن من السعادة والشقاوة الی الابد فلا مجال للتغییر

---

[۱] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۴۱

[۲] ملاحظہ فرمائیں قاموس الکتاب المقدس، مادہ ہیکل نیز ان موارد کو جن کا صاحب قاموس نے ذکر کیا ہے۔

ولا للتبدیل، وانما یعمل الناس الیوم فیما قد فرغ منہ۔"

مطلب یہ ہے کہ انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے اس کے لئے نادانستہ طور پر ناگزیر ہو جاتا ہے کہ وہی کام انجام دے جو قلم تقدیر نے اس کے لئے لکھ دیا ہے اور چونکہ قلم کی روشنائی سوکھ چکی ہے اور اس نے لکھنا بند کر دیا ہے، لہٰذا انسان کے لئے کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی قسمت کے فیصلہ میں کسی طرح کی رد و بدل کر سکے۔

جیسا کہ خود خداوند متعال بھی کسی چیز کو تبدیلی و تغیر نہیں دے سکتا پس یہ صحیح نہیں ہے کہ:۔

"یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت" [اللہ جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) باقی رکھتا ہے] (رعد/۳۹)

بلکہ یہودیوں کی بات درست ہے کہ:۔

وقالت الیہود ید اللہ مغلولۃ، غلت ایدیھم ولعنوا بما قالوا بل یداہ مبسوطتان ینفق کیف یشاء" (مائدہ/۶۴)

اور یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، ان ہی کے ہاتھ باندھ دیئے جائیں ان کے اس قول پر خدا کی جانب سے لعنت ہو، بلکہ اس (خدا) کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہتا ہے انفاق کرتا ہے۔"

مشرکین بھی اسی گمان میں تھے کہ وہ اپنے کردار و اعمال میں مجبور ہیں اور ان کے اعمال میں اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے۔ چنانچہ خداوند عالم ان کے قول کو نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

وقال الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما عبدنا من دونہ من شئ نحن ولا اباؤنا" ولا حرمنا من دونہ من شئ ... (نحل/۳۵)

اور مشرکین کہتے ہیں اگر خدا چاہتا تو نہ ہم ہی اس کے سوا کسی اور چیز کی پرستش کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا۔ اور نہ ہی ہم بغیر اس کی مرضی کے کسی چیز کو حرام کر بیٹھتے۔

طبری کے یہاں آفرینش قلم کی روایتیں

طبری کے یہاں ایسی بہت سی روایتیں "خلق قلم" کے موضوع پر موجود ہیں کہ ان سب میں انسان کے

بجور و بے اختیار ہونے پر زور دیا گیا ہے، لوگ نادانستہ و ناگزیر طور پر کاموں کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں، ہم یہاں قلم کی پیدائش سے متعلق محض دو روایتیں اشارتاً نقل کر رہے ہیں قارئین کرام مزید تحقیق کے لئے "تاریخ الامم والملوک" کے شروع میں "القول فی ابتداء الخلق ما کان اوّلہ" کے عنوان سے کی جانے والی بحث کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

طبری نے خود اپنی سند کے تحت عبادہ ابن صامت سے نقل کیا ہے کہ عبادہ نے اپنے فرزند سے کہا:

سمعت رسول اللّٰہؐ یقول: ان اوّل ماخلق اللّٰہ القلم، فقال لہ: اکتب، فجری فی تلک الساعۃ بماھو کائن" [1]

"میں نے رسول خداؐ سے سنا کہ آپؐ نے فرمایا: سب سے پہلے خدا نے قلم کو پیدا کیا، پس اس سے کہا لکھ، پس اسی وقت سب کچھ لکھ گیا جو کچھ کہ ہونے والا تھا۔

نیز طبری لکھتا ہے: حدثنی محمد بن معاویہ الانماطی، حدثنا عباد بن العوام، حدثنا عبد الواحد بن سلیم، قال سمعت عطا۔۔۔

میں نے ولید ابن عبادہ ابن صامت سے پوچھا تیرے باپ نے مرتے وقت تجھ سے کیا وصیت کی؟ ولید نے کہا: میرے باپ نے مجھے بلایا اور کہا: اے فرزند خدا سے ڈرو اور یاد رکھو تم تقوائے الٰہی نہیں حاصل کر سکتے مگر جب تک کہ خدائے یکتا اور اس کے (خیر ہو یا شر) مقدرات پر ایمان نہ لے آؤ، بے شک میں نے رسول خداؐ سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ان اوّل ماخلق اللّٰہ عزّ وجل القلم فقال لہ: اکتب قال: یارب وما اکتب قال: اکتب القدر قال: فجری القلم فی تلک الساعۃ بما کان وبما ھو کائن الی الابد۔" [2]

خداوند عزوجل نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا پس اس سے کہا لکھ: اس نے کہا کیا لکھوں، کہا تقدیر لکھو، (رسولؐ نے) کہا: پس قلم نے اسی وقت جو کچھ ابد الآباد تک ہونا تھا قلمبند کر دیا۔

اس سلسلہ میں دوسری روایات بھی ہیں کہ جن کا طبری نے ذکر کیا ہے، قارئین ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ [3]

---

[1] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۳۲

[2] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۳۲ و ۳۳

[3] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۳۴ اور اس کے بعد نیز ص ۵۱ و ۵۲

طبری نے ابن عباس یا ابن عمر سے بھی روایت کی ہے :۔

"ان اوّل ماخلق اللہ القلم، فقال لہ، اجر فجری بما ھو کائن وانما یعمل الناس الیوم فیما قد فرغ منہ " [1]

بے شک خدا نے سب سے پہلے قلم کو خلق کیا پس اس سے کہا چل، پس وہ چلا اور سب کچھ لکھ دیا اور آج لوگ بس وہی عمل انجام دیتے ہیں جو کچھ یہ قلم لکھ چکا ہے۔

آفرینش کے ایام اور خدا کا آرام کرنا

توریت میں ہے : پروردگار نے چھ روز میں آسمان، زمین، دریا اور جو کچھ ان میں ہے سب پیدا کیا اور ساتویں دن کو آرام واستراحت کا دن قرار دیا، یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے روز شنبہ کو مبارک اور مقدس دن شمار کیا ہے۔ [2]

طبری نے بھی اپنی تاریخ میں اسی مضمون کی بہت سی روایتیں نقل کی ہیں جن میں خداوند عالم کا یکشنبہ کے دن عالم کی آفرینش شروع کرنا، جمعہ کے دن اس کی تکمیل کرنا اور اس کے بعد شنبہ کے دن خداوند عالم کا تخلیقی امور سے فراغت پاجانا تاکید کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ ہم اس مضمون کے ذیل میں محض وہ روایات پاتے ہیں جو طبری نے اہل کتاب سے نقل کی ہیں، طبری کہتا ہے :۔

عن المثنی بن ابراھیم قال : حدثنا عبد اللہ بن صالح حدثنی ابو معشر، عن سعید بن ابی سعید، عن عبد اللہ بن سلام، انہ قال : ان اللہ بدأ الخلق یوم الاحد، فخلق الارضین فی الاحد والاثنین وخلق الاقوات والرواسی فی الثلاثاء والاربعاء وخلق السموات فی الخمیس والجمعۃ وفرغ فی آخر ساعۃ من یوم الجمعۃ، فخلق فیھا آدم علی عجل، فتلک الساعۃ التی تقوم فیھا الساعۃ [3]

---

[1] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۳۴ و ۳۵

[2] عہد قدیم، سفر خروج اصحاح بستم فقرہ ۱۱

[3] تاریخ الامم والملوک جلد ۱ ص ۴۷

"مثنیٰ ابن ابراہیم نے (اپنی اسناد کے ساتھ) عبد اللہ ابن سلام سے روایت کی ہے، اس نے کہا: اللہ نے اتوار کے دن تخلیق کا آغاز کیا پس اتوار اور دوشنبہ کو زمینیں خلق کیں، منگل اور بدھ کو سامان خوراک (سبزہ و میوہ جات) اور پہاڑ وغیرہ خلق کئے، جمعرات اور جمعہ کو آسمانوں کی تخلیق کی، اور جمعہ کے دن آخری اوقات میں وہ ان امور (تخلیق) سے فارغ ہوا، پس جلدی سے اسی دن اس نے آدم کو خلق کیا، پس یہی وہ گھڑی ہے جس سے زمانے کا آغاز ہوا ہے"۔

ایک دوسری روایت بھی اسی مضمون کی طبری نے عبد اللہ ابن سلام سے ہی روایت کی ہے۔[1]

لیکن ایک اور روایت میں طبری کہتا ہے:۔

حدثنا ابن حمید قال: حدثنا جریر عن الاعمش، عن ابی صالح، عن کعب قال: بدأ اللّٰہ خلق السمٰوات والارض یوم الاحد والاثنین والثلاثاء والاربعاء والخمیس وفرغ منها یوم الجمعة، قال: فجعل مکان کل یوم الف سنة[2]"

"... خداوند عالم نے زمین اور آسمانوں کی تخلیق اتوار کو شروع کی اور دوشنبہ منگل بدھ جمعرات یہاں تک کہ جمعہ کو اس سے فارغ ہوا، (کعب نے) کہا: پس ہر دن کو ایک ہزار سال کے برابر قرار دیا۔"

اس ضمن میں طبری نے جو روایتیں نقل کی ہیں ان کی تعداد بہت ہے یہاں ان سب کا ذکر ممکن نہیں ہے۔

۵- انبیاءؑ کی خطائیں:

توریت میں متعدد مقامات پر صراحت کے ساتھ انبیاء کی جانب گناہان کبیرہ تک کی نسبت دی گئی ہے (جبکہ یقیناً انبیاء علیہم السلام کا مقام و رتبہ اس طرح کی ناروا نسبتوں سے پاک و منزہ ہے)

ہم یہاں اس طرح کی روایت کا صرف ایک نمونہ اللہ کے نبیوں میں ایک نبی جناب داؤد علیہ السلام کے سلسلہ میں پیش کرتے ہیں اور آپ دیکھیں گے کہ طبری نے اسی قصہ کو اپنی تاریخ میں بھی، البتہ اس کے بعض حصوں کو حذف کرتے ہوئے، ثبت کر دیا ہے۔

---

[1] تاریخ الامم جلد ۱ ص ۵۵ و ۵۶

[2] تاریخ الامم جلد ۱ ص ۵۹

توریت (سموئیل دوم کے گیارہویں باب) میں ہے (معاذاللہ):۔

"رات کا وقت تھا کہ داؤد اپنے تخت سے اٹھے اور اپنے قصر حکومت کی چھت پر پہنچ گئے ناگاہ اس بلندی سے ایک عورت کو دیکھا کہ غسل کر رہی تھی، عورت واقعی خوبصورت تھی، پس داؤد نے کسی کو اس عورت کا حال معلوم کرنے کے لئے روانہ کیا، ایک شخص نے کہا: آیا یہ عورت، شیع، "بعام کی بیٹی اور "اوریای حتی" کی بیوی نہیں ہے؟"

"پس داؤد نے کچھ لوگوں کو بھیجا وہ اس عورت کو پکڑ لائے، داؤد اس عورت سے ہم بستر ہوئے، اس وقت وہ عورت خون حیض سے پاک تھی، عورت گھر واپس ہوئی، وہ حاملہ ہو چکی تھی اس نے داؤد کے پاس آدمی بھیج کر حاملگی کی اطلاع دی، داؤد نے (عورت کے شوہر) "اوریا" کے پاس آدمی بھیجا اور اس کو جنگ (کے میدان) سے واپس بلایا اور حکم دیا کہ وہ گھر جائے (داؤد کا مقصد یہ تھا کہ "اوریا" اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستر ہو جائے اور بیوی کا حمل اس پر مشتبہ ہو جائے) لیکن "اوریا" اپنے دوستوں کی مدد کی غرض سے کہ جو فی سبیل اللہ جنگ کر رہے تھے اور تابوت کے ہمراہ جدوجہد میں مشغول تھے چلا گیا اور گھر نہ گیا۔ چونکہ "اوریا" جنگ پر چلا گیا۔ داؤد نے اپنے سپہ سالار کو لکھا کہ "اوریا" کو محاذ جنگ پر آگے بھیج دے اور لوگ اس کو چھوڑ کر پلٹ آئیں تاکہ وہ مارا جائے، پس انہوں نے ایسا ہی کیا "اوریا" قتل کر دیا گیا۔ انہوں نے اس کی موت کی خبر داؤد کو دے دی، داؤد نے اس عورت کے پاس آدمی بھیجا اور اس کو اپنے گھر بلوالیا، اور اس عورت نے زنا کے ذریعہ ان کے لئے ایک فرزند پیدا کیا (۲ سموئیل ۱۱: ۶ - ۲۷)

"پس خداوند عالم نے ناتان نبی کو داؤد کے پاس بھیجا اور ان سے کہا: "قد كان في مدينة رجلان واحد فقير له نعجة واحدة عزيزة عليه والاخر له غنم وبقر كثيرة جداً فاخذ الغني نعجة الفقير . . . . ."

"شہر میں دو افراد تھے ایک فقیر تھا، اس کے پاس ایک بھیڑ تھی جو اسے بہت عزیز تھی اور دوسرے کے پاس واقعاً بہت سی بکریاں اور گائیں تھیں پس دولتمند نے فقیر کی بھیڑ لے لی . . . . ."

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ طبری نے اپنی تاریخ میں توریت کی اس پوری روایت کو، عورت کے ساتھ گھر پہ بلا کر، داؤد کے زنا کرنے اور عورت کے حمل کو مشتبہ بنانے کی غرض سے اس کے شوہر کو میدان جنگ

سے واپس بلانے کی داستان کے علاوہ، بعینہ نقل کر دیا ہے۔[۱]

جی ہاں! طبری اس من گھڑت جھوٹی و شرم آور داستان کو نقل کرتا ہے اور بڑی بے باکی سے خدا کے نبیوں میں سے ایک نبی پر ایک مومن شخص کے قتل تک کا اتہام لگاتا ہے جب کہ ایک مومن کا قتل عظیم گناہان کبیرہ، اور زشت ترین فواحش میں سے ہے اور پیغمبران الٰہی کی ذوات مقدسہ ایسے امور سے بالکل پاک ہے۔

اہل بیت علیہم السلام کی ان تہمتوں سے مقابلہ آرائی

دوسری جانب اہل بیت علیہم السلام ان دروغ بافیوں کے مقابل ان کی تکذیب و بیخ کنی میں مشغول تھے، امیرالمومنین علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:-

من تحدثکم بحدیث داوٗد علی ما یرویہ القصاص جلدتہ مأۃ و ستّین، وھی حد الفریہ علی الانبیاء"[۲]

یعنی "جو شخص بھی تمہارے سامنے داستان سراؤں کے انداز پر داوٗد کا واقعہ دہرائے اس کو ایک سو ساٹھ تازیانے لگائے جائیں گے اور یہ انبیاء پر جھوٹی تہمت باندھنے کی حد (سزا) ہے۔"

حضرت علیؑ نے اس بیان میں ایسے مطالب نقل کرنے والے کو داستان سراؤں کے نام سے یاد کیا ہے اور یہ وہی اسلام قبول کرنے والے اہل کتاب اور ان کے مرید و شاگرد ہیں جنھوں نے تاریخ میں خرافاتی روایتیں نقل کی ہیں، اور "تمیم داری" وہ پہلا شخص ہے جس نے مسجد میں قصہ گوئی کا در باز کیا ہے۔

راوندی نے اپنی کتاب "قصص الانبیاء" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے دو روایتیں نقل کی ہیں جن میں حضرت داوٗد پیغمبرؑ کو اس ذلیل جھوٹ سے مبرا د بتایا گیا ہے۔[۳]

۱ے تاریخ الامم جلد ۱ ص ۴۸۰ تا ۴۸۴

۲ے الھدیٰ الی دین المصطفیٰ جلد ۱ ص ۱۰۷

۳ے الھدیٰ الی دین المصطفیٰ جلد ۱ ص ۱۰۷

جنت میں آدمؑ کے فریب کھانے کی داستان

طبری نے جنت سے حضرت آدم کے نکالے جانے کے سلسلہ میں "وھب ابن منبہ" سے ایک روایت نقل کی ہے وہ کہتا ہے:۔

شیطان ایک ایسے سانپ کے پیٹ میں داخل ہو گیا جو پاؤں رکھتا تھا، اور تنومند اونٹ کی مانند بہشت کی طرف بڑھ رہا تھا۔"

طبری اضافہ کرتا ہے: شیطان حواء کے قریب آیا اور ان سے کہا: اس درخت کی طرف دیکھو کہ یہ کتنا خوشبودار، خوش ذائقہ اور خوش رنگ ہے، پس حواء نے اس درخت کو پکڑا اور (اس کا پھل) کھالیا. اس کے بعد حواء آدم کے پاس گئیں اور ان سے کہا: اس درخت کی طرف دیکھو یہ........

پس آدم نے اس درخت سے کھالیا "فبدت لھما سوءاتھما" یعنی اس درخت سے کھانے کے بعد ان دونوں کی شرمگاہیں ظاہر ہوگئیں، آدم اس درخت میں داخل ہو گئے تو ان کے پروردگار نے آواز دی، اے آدم! کہاں ہو؟ آدم نے کہا: پروردگار! میں یہاں ہوں۔ خدا نے کہا: کیا باہر نہیں آؤ گے؟ آدم نے کہا: مجھے تجھ سے شرم آتی ہے۔ خداوند نے کہا: میری رحمت سے وہ زمین دور ہو جائے جس سے میں نے تم کو پیدا کیا ہے، یہاں تک کہ اس کے تمام میوے خار میں تبدیل ہو جائیں!

کہا: اور بہشت میں کیلے اور بیر سے اچھا کوئی درخت نہ تھا، اس کے بعد خداوند عالم نے حواء سے کہا: تم نے میرے بندے کو دھوکا دیا پس تم کوئی بچہ پیٹ میں پرورش نہ دے سکو گی مگر سخت دشواریوں کے ساتھ، اور جب تم زمین پر اپنا کوئی فرزند پیدا کرنا چاہو گی تو تمہیں بارہا موت سے ہمکنار ہونا پڑے گا۔

اور خداوند نے سانپ سے کہا: تو وہی ہے جس کے پیٹ میں وہ ملعون — شیطان — داخل ہو گیا، تاکہ میرے بندے کو دھوکا دے۔ تو میری رحمت سے دور ہو جا، یہاں تک کہ تیرا پاؤں تیرے بدن میں پنہاں ہو جائے اور خاک کے علاوہ تجھ کو کچھ کھانے کو نہ ملے تو آدم کے فرزند کا دشمن ہے اور وہ تیرے دشمن ہیں، جہاں کہیں ان کو دیکھے گا ان کا پیچھا کرے گا

اور وہ بھی جہاں کہیں تجھے پائیں گے تیرا سر کچل دیں گے۔[۱]

توریت میں آدمؑ کے فریب کی داستان

توریت میں حضرت آدمؑ کو اس درخت سے جو "خیر و شر کی شناخت" کا درخت تھا، کھانے کو منع کئے جانے کا ذکر کرنے کے بعد آیا ہے:۔

"...سانپ خشکی کا مکار ترین جانور تھا کہ پروردگار عالم نے اس کو پیدا کیا، پس اس سانپ نے عورت (حواء) سے کہا: کیا واقعی خداوند نے کہا ہے کہ بہشت کے کسی درخت سے نہ کھانا؟ اس عورت نے سانپ سے کہا: ہم بہشت کے درختوں سے پھل کھاتے ہیں لیکن وسط بہشت میں جو درخت ہے، اس کے لئے خداوند نے فرمایا ہے کہ نہ اس کا پھل کھائیں نہ اس کو ہاتھ لگائیں تاکہ موت سے ہمکنار نہ ہوں۔ سانپ نے اس عورت سے کہا: تم ہرگز نہیں مروگی، بلکہ خداوند عالم جانتا ہے، جس دن تم نے اس کا پھل کھایا تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور خدا کی طرح تم بھی خیر و شر سے آگاہ ہو جاؤگی۔ عورت نے گمان کیا کہ اس درخت سے کھانا اچھا ہے اور آنکھوں کی شادمانی اور لذت کا سبب ہے، چنانچہ اس درخت کا پھل لیا اور کھا لیا، اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور مرد نے بھی اس پھل میں سے کھا لیا، اس وقت ان کی آنکھیں کھل گئیں اور خود کو برہنہ پایا اور درخت انجیر کے پتوں سے اپنی ستر پوشی کی۔ انہیں اس عالم میں صدائے پروردگار سنائی دی جو نسیم کے جھونکے چلتے وقت روزانہ ہی بہشت میں چہل قدمی کرتا تھا۔ پس آدم اور ان کی بیوی نے درخت بہشت کے درمیان آکر خود کو اپنے پروردگار سے مخفی کر لیا۔ پروردگار عالم نے آدم کو صدا دی اور ان سے کہا تم کہاں ہو؟ آدم نے کہا: میں نے تیری آواز بہشت میں سنی اور چونکہ عریاں تھا ڈر کے چھپ گیا۔ خدا نے کہا: کس نے تم کو سمجھا دیا کہ تم عریاں ہو؟ آیا اس درخت سے تم نے کھالیا ہے جس سے میں نے منع کیا تھا؟ آدم نے کہا: وہ عورت جو تو نے میرے ساتھ کر دی ہے اس نے مجھے اس درخت کا (پھل) دیا اور میں نے کھا لیا۔ پس پروردگار عالم نے اس عورت سے کہا: یہ تو نے کیا کیا؟ عورت نے جواب دیا، سانپ نے مجھ کو دھوکا دیا اور میں نے اس درخت سے کھا لیا۔ پروردگار عالم نے سانپ سے کہا: تو تمام چارپایوں اور

[۱] تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۱۰۸

خشکی میں رہنے والے وحشی جانوروں کے درمیان رحمت سے محروم ہوگیا، تو پیٹ کے بل رینگے گا اور زندگی بھر خاک پھانکے گا میں تیرے اور اس عورت کی نسل کے درمیان دشمنی برقرار کرتا ہوں وہ تجھ کو ماریں گے اور تو ان کو ڈسے گا۔ اور اس عورت سے کہا: تیری حاملگی کی تکلیف میں اضافہ کروں گا بڑے درد کے ساتھ بچے جنے گی... اور آدم سے کہا: زمین تیرے لئے ملعون ہے (کیونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مان لی، اور اس درخت سے تونے کھالیا جس سے میں نے کھانے کو منع کیا تھا) تو اپنی پوری زندگی میں سختی کے ساتھ زمین سے روزی حاصل کرے گا۔ تیرے لئے خس وخاشاک روئیدہ ہوں گے اور تو محنت کرکے اپنی زراعت کا ثمرہ کھائے گا، ماتھے کے پسینہ سے روٹی حاصل کرے گا یہاں تک کہ اسی زمین میں جس سے تو اٹھایا گیا ہے واپس پلٹ جائے گا کیونکہ تو مٹی سے ہے اور مٹی میں ہی بدل جائے گا۔[1]

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، طبری نے جو کچھ وہب سے روایت کیا ہے بالکل وہی چیز ہے جو توریت میں کہی گئی ہے بس فرق یہ ہے طبری نے ذرا اچھے اور خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے حتی خصوصیات وجزئیات کو بھی طبری نے محفوظ رکھا ہے!

وہب ابن منبہ بھی کعب الاحبار، عبد اللہ ابن سلام اور تمیم الداری وغیرہ کی مانند اسلام قبول کر لینے والے اہل کتاب کے زمرہ میں آتا ہے۔

آخری نمونہ

قبل اس کے کہ ہم مقالہ کو آخری منزل تک پہنچائیں، ایک نکتہ کی جانب اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ خود طبری نے بھی اپنی کتاب میں، کعب الاحبار کی تکذیب اور اس پر اسلام میں اسرائیلیات وارد کرنے کا الزام، ابن عباس کی زبانی نقل کرتے ہوئے لکھا ہے: "ایک روز ابن عباس بیٹھے ہوئے تھے، کہ ایک شخص پہنچا اور ان سے کہا: اے ابن عباس میں نے سورج اور چاند کے بارے میں کعب الاحبار سے عجیب وغریب بات سنی!

ابن عباس اس وقت ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے یہ بات سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے اور پوچھا وہ بات کیا تھی؟ اس شخص نے کہا: کعب کا خیال ہے کہ روز قیامت خورشید وماہ دو بے تند گائے[2]

[1] عہد قدیم سفر تکوین اصحاح سوم فقرات ۱ - ۱۹

کی صورت میں لاکر جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے! عکرمہ کہتا ہے: ابن عباس یہ سن کر بھڑک اٹھے اور غصہ کے ساتھ کہا: کعب جھوٹ بولتا ہے، کعب جھوٹ بولتا ہے، کعب جھوٹ بولتا ہے، وہ ایک یہودی شخص ہے جو ان مطالب کو اسلام میں داخل کرنا چاہتا ہے... [1]

کعب کے بارہ میں خلیفہ دوم کی مخالفت

طبری نے نقل کیا ہے کہ: جب عمر بن الخطاب "جابیہ" سے "ایلیا" کی طرف پلٹے اور در مسجد کے نزدیک پہنچے، کہا: کعب سے ہوشیار رہو!

اس کے بعد روایت نقل کرتا ہے: دوسرے دن، جب عمر لوگوں کے ساتھ صبح کی نماز پڑھ چکے تو پلٹے اور کہا: کعب کو میرے سامنے لاؤ، لوگ کعب کو ان کے پاس لے آئے، عمر نے اس سے کہا: تیری نظر میں ہم مصلا کہاں قرار دیں؟ کعب نے کہا: (یہودیوں کے قبلہ) صخرہ کی طرف۔

عمر نے کہا: اے کعب! خدا کی قسم تو یہودیت سے میل وشباہت رکھتا ہے، جس وقت تو نے اپنا جوتا اتارا ہے میں نے دیکھا ہے (یعنی اب بھی تیرے دل میں یہودیوں کے عقائد کا احترام باقی ہے)

کعب نے کہا: میں چاہتا تھا کہ اس پر اپنے قدم رکھوں۔

عمر نے کہا: ہاں میں نے تجھ کو دیکھ لیا، لیکن ہم صدر مسجد کو قبلہ قرار دیتے ہیں جیسا کہ رسول خدا نے ہماری مسجدوں کا قبلہ صدر مسجد کو قرار دیا ہے، پلٹ آ، کیونکہ ہم کو صخرہ کا حکم نہیں دیا گیا ہے، کعبہ کے لئے حکم ملا ہے، پس عمر نے مسجد کا قبلہ صدر مسجد کو قرار دیا.... اس کے بعد عمر مصلیٰ سے اٹھے اور ایک ویرانہ کی طرف گئے جہاں رومیوں نے بیت المقدس کو دفن کر دیا تھا، اور جس زمانے میں بنی اسرائیل کا وہاں تسلط ہوا انھوں نے اس کا کچھ حصہ باہر نکالا تھا اور بقیہ کو یوں ہی چھوڑ دیا تھا۔

عمر نے کہا: اے لوگو! جو کچھ میں انجام دوں، تم بھی انجام دو، عمر دو زانو ہو کر (یا دونوں پنجوں پر بل دے کر) اس جگہ کے بیچ میں بیٹھ گئے اس طور پر کہ خس و خاشاک ان کے

---

[1] تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۶۵

لباس پر بیٹھ گیا تھا۔

اسی عالم میں عمر نے پشت سے تکبیر کی آواز سنی (اور چونکہ وہ ہمیشہ دوسروں کے غلط ارادوں سے بیمناک رہتے تھے) سوال کیا، یہ کیسی تکبیر ہے؟ ان سے کہا گیا کہ کعب نے تکبیر کہی ہے اور لوگوں نے بھی اس کی تاسی میں تکبیر کہی ہے۔ عمر نے کہا: کعب کو میرے پاس لاؤ جب کعب کو حاضر کیا گیا تو اس نے کہا: اے امیر المومنین! یہ کام جو آپ نے آج انجام دیا ہے، وہی کام ہے جس کی پانچ سو سال قبل ایک نبی نے خبر دی ہے[1]....."

اس مقالہ میں ہم نے "اسرائیلیات" کے انبار سے محض چند نمونے پیش کئے ہیں، جو تاریخ طبری کے اوراق میں چھپے ہوئے ہیں ویسے ہی جیسے اس طرح کے اسرائیلیات حدیث تاریخ اور رجال کی دوسری تمام کتابوں میں کثرت سے چھپے پڑے ہیں:

چنانچہ ہم یہاں موقع کو غنیمت جانتے ہوئے تمام محققین و ماہرین سے خواہش کرتے ہیں کہ اسلامی و ثقافتی میراث پر پہلے سے زیادہ توجہ صرف کرتے ہوئے ان غلط اور بے بنیاد مسائل کے تصفیہ کے بارے میں غور و فکر کریں۔ منجملہ ان کے طبری کی "تاریخ الامم والملوک" بھی ہے جس کے بہت سارے صفحات حقیقت سے دور تحریف شدہ مطالب سے پُر ہیں! بنابرایں، اس کتاب میں نیز اس کے جیسی دیگر کتابوں میں مذکورہ اسناد و نصوص پر تحقیق و تنقید اور چھان بین کی ضرورت ہے، ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد و اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔

[1] تاریخ الامم والملوک جلد ۳ ص ۶۱۱

فہرست جلد ہفتم مجلۂ توحید

موضوع	شمارہ	صفحہ	مقالہ نگار
شذرہ			
انسانیت ساز وجود	۱	۵	مدیر
مثبت انتظار	۲	۵	"
مذہب افیون یا اکسیر	۳	۵	"
امام خمینیؒ وارث غدیر	۴	۵	"
کعبہ دشمنوں کے نرغے میں	۵	۵	"
اب بھی اگر مسلمانوں کو ہوش نہ آیا!	۶	۵	"
قرآن کریم			
بیان تفسیر	۱	۹	جناب سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضلؒ
" "	۲	۹	" " " "
" "	۳	۹	" " " "
امام خمینیؒ اور قرآن	۴	۳۱	جناب شیخ جعفر سبحانی
بیان تفسیر	۵	۱۱	جناب سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضلؒ
" "	۶	۱۱	" " " "
عقائد و معارف			
پیغمبروں کی آمد کا مقصد	۱	۱۸	شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر

موضوع	شمارہ	صفحہ	مقالہ نگار
امامت قرآن کی روشنی میں	۱	۳۵	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
روح اور مادیوں کا اشتباہ	۱	۵۵	جناب شیخ حسین نوری
قرآن میں انبیاءؑ کے جلوے	۲	۲۷	شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر
معاد۔ انبیاءؑ اولیاء اور حکماء کی نظر میں	۲	۶۵	جناب شیخ حسین نوری
امامت و رہبری	۲	۱۱۱	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
امامت ائمہؑ اطہار کی نظر میں	۳	۱۷	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
انبیاء کے درمیان فرق کے اسباب	۳	۲۵	شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر
تجسم اعمال	۳	۴۹	جناب شیخ حسین نوری
خدا کی معرفت	۳	۵۷	جناب محمد تقی مصباح یزدی
حضرت موسیٰؑ	۵	۲۵	شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر
جزا و سزا اور تجسم اعمال	۵	۴۱	جناب شیخ حسین نوری
خدا کی فطری معرفت	۵	۵۱	جناب محمد تقی مصباح یزدی
حضرت عیسیٰؑ	۶	۱۷	شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر
جزا و سزا اور تجسم اعمال	۶	۲۵	جناب شیخ حسین نوری
خدا کی فطری معرفت	۶	۳۷	جناب محمد تقی مصباح یزدی
فکر و نظر			
عورت اسلام اور دیگر مکاتب فکر کی نظر میں	۱	۶۳	رہبر انقلاب حضرت آیت اللہ خامنہ ای مدظلہ
کلامی فرقے	۱	۷۵	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
مستحسن اختلاف مذموم اختلاف	۱	۹۹	جناب شیخ جوادی آملی
حقوق کی بنیاد اور سرچشمہ	۱	۱۰۷	جناب محمد تقی مصباح یزدی
سیاسی رہنماؤں کے خصوصیات	۱	۱۲۵	جناب محمد تقی رہبر
عرفان	۲	۱۷	استاد شہید مرتضیٰ مطہری

موضوع	شمارہ	صفحہ	مقالہ نگار
تہذیب نفس کے ذریعہ انبیاءؑ کی پیروی	۲	۵۷	جناب شیخ جوادی آملی
قرآن، عظیم ترین الٰہی تحفہ	۲	۷۳	جناب محمد تقی مصباح یزدی
حکومت کے ارکان	۲	۹۱	جناب محمد تقی رہبر
شیطانی سازشیں	۲	۱۲۳	سازمان تبلیغات اسلامی
عرفان کی مختصر تاریخ	۳	۱۷	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
تفکر اور تزکیۂ نفس کا راستہ	۳	۹۷	جناب شیخ جوادی آملی
سپہ سالاروں کے خصوصیات	۳	۱۰۵	جناب شیخ محمد تقی رہبر
شیطانی سازشیں	۳	۱۲۱	سازمان تبلیغات اسلامی
"ایک عرفانی خط"	۴	۱۳	حضرت امام خمینی قدس سرہ
امام خمینیؒ کے افکار میں قرآنی تجلیاں	۴	۴۷	جناب سید علی شاہچراغی
امام خمینیؒ اور عرفان	۴	۸۵	جناب محمد سروش
امام خمینیؒ اور یونیورسٹی	۴	۱۰۳	استاد ابراہیم امینی
امام خمینیؒ اور اسلامی انقلاب	۴	۱۲۱	جناب عبد الحسین سرحدی
امام خمینیؒ اور اسلام میں عورت کے حقوق	۴	۱۴۵	محترمہ زہرا مصطفوی
امام خمینی اور عبادات و شعائر	۴	۱۶۹	جناب حائری شیرازی
امام خمینیؒ اور جہاد کی حکمت عملی	۴	۱۸۱	جناب سید رضا نقوی
امام خمینیؒ ایک بے مثال رہبر	۴	۲۱۵	جناب سید حسن عباس فطرت
امام خمینیؒ کے امتیازات و خصوصیات	۴	۲۳۱	جناب مولوی اسحاق مدنی
امام خمینیؒ اور شیطانی سازشیں	۴	۲۴۳	سازمان تبلیغات اسلامی
منازل و مقامات	۵	۶۵	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
سید الشہداءؑ کا کامیاب جہاد	۵	۸۳	شہید ڈاکٹر بہشتی
منطق ۔ غور و فکر کا سلیقہ	۵	۹۷	جناب شیخ جوادی آملی
حکومت اور عوام کا رابطہ	۵	۱۱۱	جناب محمد تقی رہبر

موضوع	شمارہ	صفحہ	مقالہ نگار
تہمت	۵	۱۳۳	جناب ناصر باقری بیدھندی
افکار امام خمینیؒ کی روشنی میں ـ تیسرطبقہ کے چند نقوش	۶	۵۱	جناب سید احتشام عباس زیدی
فرعونی امریکہ کے خلاف اسلامی اصولوں کی فتح	۶	۵۷	جناب سید ولی الحسن رضوی
عرفانی اصطلاحیں	۶	۶۹	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
اسلامی تفکر میں فلسفہ کا کردار	۶	۸۱	جناب شیخ جوادی آملی
حکومت اور عوام کے ایک دوسرے پر حقوق	۶	۹۷	جناب محمد تقی دبیر
تہمت	۶	۱۰۷	جناب ناصر باقری بیدھندی
تاریخ وسیر			
رسول اسلامؐ روایات کی روشنی میں	۱	۱۴۷	علامہ طباطبائیؒ
طبری کا علمی و ثقافتی تعارف	۱	۱۵۱	جناب رسول جعفریان
رسول اسلامؐ روایات کی روشنی میں	۲	۱۴۳	علامہ طباطبائیؒ
طبری کا مذہب	۲	۱۵۱	جناب رسول جعفریان
رسول اسلامؐ روایات کی روشنی میں	۳	۱۴۱	علامہ طباطبائی
طبری کا مذہب تاریخ نگاری	۳	۱۴۹	جناب صادق آئینہ وند
رسول اسلام روایات کی روشنی میں	۵	۱۴۳	علامہ طباطبائیؒ
طبری کی روش تاریخ نگاری	۵	۱۴۹	جناب سید مرتضیٰ عسکری
رسول اسلام روایات کی روشنی میں	۶	۱۲۷	علامہ طباطبائیؒ
تاریخ طبری میں اسرائیلیات	۶	۱۳۵	جناب سید جعفر مرتضیٰ عاملی

امام خمینی قدس سرہ نے فرمایا

"اے مسلمانانِ عالم اور اے ستمگاروں کے زیر تسلط غریب و ستم رسیدہ لوگو! اٹھ کھڑے ہو، ایک دوسرے سے اتحاد و دوستی کا ہاتھ ملا کر اسلام نیز اپنے مقدرات کا دفاع کرو اور بڑی طاقتوں کے شور و ہنگاموں اور لن ترانیوں سے نہ ڈرو کیوں کہ یہ صدی خدائے قادر و توانا کے منشاء کے مطابق مستکبروں پر ضعیفوں اور کمزوروں نیز باطل پر حق کی فتح کی صدی ہے۔

کیا یہ بات مسلمانوں کے لئے ننگ و رسوائی کا سبب نہیں ہے کہ وہ اس قدر انسانی، مادی اور معنوی سرمائے لیسے ترقی یافتہ مکتب فکر اور الٰہی اعتماد و نصرت کے باوجود اس صدی کی استکباری طاقتوں اور دریائی و زمینی ڈاکوؤں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں؟ کیا اب بھی اس کا وقت نہیں آیا کہ اپنی نفسانی خواہشات کو دور رکھ کر ایک دوسرے کی طرف محبت و دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور انسانیت کے دشمنوں کو میدان سے نکال باہر کریں اور بادشاہوں کے ظلم و ستم کے تحت اپنی ذلیل و رسوا زندگی کا خاتمہ کریں۔...." (۶۰/۶/۱۶ ھ ش)

"بڑی طاقتیں تمہاری (اسلامی ممالک) محتاج ہیں۔ اگر تم ایک روز اپنے اسلحوں اور وسائل کو بروئے کار لاؤ تو وہ تمہاری اطاعت گزار بن جائیں گی؛ افسوس کہ یہ (بڑی طاقتیں) ہمارے ذخیرے بھی لے جا رہے ہیں اور حکومتیں ان کی غلام بھی بنی ہوئی ہیں۔"

(۵۸/۱۰/۲۰ ھ ش)